جلد : ۷ ابریل ۱۹۶۹ء عدد ۲

ماهنامه

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرسالانہ : سات روپے فی پرچہ ۵۰ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۱	اپریل ۱۹۶۹ء مطابق محرم الحرام ۱۳۸۹ھ	عدد ۲

ابوالخیر مودودی، پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

بعض سادہ لوح افراد جو اشتراکیت کو غلط فہمی کی بنا پر معاشی عدل کا ایک مؤثر پروگرام سمجھ بیٹھے ہیں ہم سے بار بار پوچھتے ہیں کہ ہم "انسانی فوز و فلاح کی اس تحریک" کی آخر کیوں تائید اور حمایت نہیں کرتے۔ ان سب حضرات کے استفسار کے جواب میں ہم نہایت واضح طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک انسانی فلاح و بہبود کا کوئی پروگرام جس کی بنیاد تعلیم ربانی پر نہ ہو، سراسر ضلالت اور گمراہی ہے اور اس سے نہ صرف ہم خود خدا کی پناہ مانگتے ہیں بلکہ پوری انسانیت کو بچانے کے آرزومند ہیں۔ جو نظریہ یا طرزِ عمل انسان کے لیے آخرت میں گھاٹے کا سودا ہے اس کے اپنانے سے اس دنیا میں کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض سادہ لوح دوزخ کی کلفتوں کو جنت کی آسائش خیال کرنے لگیں۔

ہم صرف اشتراکیت کے مخالف نہیں بلکہ دنیا کی ہر اس شے، دنیا کے ہر اس تصور اور دنیا کے ہر اس طرزِ فکر اور عمل کے مخالف ہیں جو اسلام سے متصادم ہو۔ ہم انسانیت کی اخروی فلاح اور دنیوی کامرانی کا واحد سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام کو سمجھتے ہیں اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ جو نظامِ حیات اسلام کی ضد ہے وہ کبھی بھی خیر و برکت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہر قسم کے خارجی دباؤ اور رائے عام کے بہاؤ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہمیشہ ہر اس قول اور فعل کی مخالفت میں آواز بلند کی جسے ہم نے اسلام کا نقیض سمجھا۔ ہم سے اگر جائز طور پر پوچھا جا سکتا ہے تو صرف یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس کسی فلسفۂ زندگی یا نظامِ حیات کو خلافِ اسلام کہنے کے کیا دلائل ہیں۔ ہم نے پہلے بھی جب کسی پالیسی یا نظریہ کی مخالفت کی تو دلائل اور معقولیت کے ساتھ کی اور جذبات کے اندر ہیجان پیدا کر کے اپنی بات منوانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اور یہی ہمارا طرزِ عمل

اشتراکیت کے بارے میں ہے۔ ہم اس نظامِ حیات کے اس وجہ سے حامی اور مؤید نہیں ہو سکتے کہ یہ نظام جس بنیادی تصور پر قائم ہے، جو فلسفۂ اخلاق یہ پیش کرتا ہے، جس طریقِ زندگی کو یہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اسے قائم کرنے کے لیے جو طریقِ کار یہ تجویز کرتا ہے وہ اسلام کے اساسی تصورات، اس کے نظامِ اخلاق، اس کے طریقِ زندگی اور اس کے طریقِ اصلاح سے ہر قدم پر متصادم ہے۔ اسی بنا پر ہم اسے کسی قیمت پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ان صفحات میں ہم مختصر طور پر ان بنیادی نکات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن میں اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

اسلام اور اشتراکیت کے درمیان سب سے پہلا اختلاف عقائد کا اختلاف ہے۔ بعض سطح بیں افراد عقیدے کے اختلاف کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مگر یہ کم عقلی ہے۔ عقیدہ وہ بیج ہے جس سے کسی نظامِ حیات کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ جس نوعیت کا یہ بیج ہوگا اسی نوعیت کا نظامِ حیات پروان چڑھے گا۔ اس نظام کے فلسفۂ زندگی، اس کے نظریۂ اخلاق، اس کے تمدن، اس کی معاشرت اور معیشت الغرض اس کے سارے گوشوں میں عقیدے کے اثرات پوری طرح نمایاں ہوں گے۔

عقائد میں سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ کوئی نظامِ حیات تخلیقِ کائنات کی علت کسے قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس علت ہی سے کسی نظام کا مزاج، اس کے عناصرِ ترکیبی، اس کے خوب و ناخوب کے پیمانے اور اس کی غایت متعین ہوتی ہے۔

اسلام کے نزدیک اس کائنات کی علت ایک حیّ و قیوم اور قادرِ مطلق ذات کا ارادہ ہے۔ وہ انسان کے سامنے یہ دعویٰ پیش کرتا ہے اور اس دعوے کی صداقت پر وہ پوری کائنات کو گواہ بناتا ہے کہ قدرت کا یہ وسیع و عریض کارخانہ کسی اندھی بہری قوت کا کھیل نہیں بلکہ ایک حکیم و علیم ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے جسے اس نے بڑی حکمت و دانائی کے ساتھ نہایت ارفع و اعلیٰ مقاصد کی خاطر تخلیق کیا ہے اور اب وہی ہر آن اس کی تدبیر و نگرانی کر رہا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید اوّلین بنیادی عقیدے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ

اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الدخان - ۳۸ - ۳۹)

"اور آسمان و زمین اور جو ان کے درمیان ہے یہ سب کچھ ہم نے کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ ہم نے ان کو برحق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

وَاللّٰهُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِهٖ وَهُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ (الرعد - ۴۱)

"اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے اور اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔ اور وہ بہت جلدی حساب لینے والا ہے"

ان دونوں آیات سے کائنات کی اُس علتِ غائی کا صاف پتہ چلتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک اور نگران ہے اور اس نے اِسے ایک خاص حکمت و مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے تو اس سے یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ انسان جو اس کائنات میں خالق کی تخلیق کا شاہکار ہے اُسے اس دنیا میں ارفع مقاصد کی خاطر جینا ہے اور پھر خدا کے حضور میں اپنی کارکردگی کا حساب پیش کرنا ہے۔ وہ عناصر اربعہ کا کھیل نہیں۔ وہ مادی قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی نہیں بلکہ وہ ایک ذمہ دار ہستی ہے جسے خدا کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو سر انجام دینا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ (الملک ۲-۳)

"وہ جس نے موت اور زندگی بنائی تاکہ اس بات کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ زبردست اور غفور ہے۔ جس نے سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ کیا رحمٰن کی تخلیق میں تم کوئی بے تکا پن دیکھتے ہو؟ پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟"

قادرِ مطلق نے موت و حیات کا جو نظام قائم کر رکھا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں کہ سطحِ آب سے ہوا کے معمولی ارتعاش کے ساتھ چند بلبلے نمودار ہوئے اور پھر اسی ہوا کے خفیف جھونکے کے ساتھ نیست و نابود ہو گئے۔

جس خالق نے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ کائنات کا یہ متوازن اور پوری طرح ہم آہنگ اور ارفع نظام تخلیق کیا ہے اسی نے موت وحیات کی بھی تخلیق کی ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ انسان اپنی زندگی کے اُس دائرے میں جس میں اسے عمل کی آزادی دی گئی ہے کہاں تک احکامِ الٰہی کی پیروی کرکے اپنے آپ کو مالک کا فرمانبردار بندہ ثابت کرتا ہے۔ بالغ نظر مفسرین نے موت وحیات کے درمیان حرفِ عطف کے استعمال سے یہ استدلال کیا ہے کہ موت وحیات ایک دوسرے کے طبعی نتائج نہیں بلکہ دونوں الگ الگ نظام ہیں جنہیں قادرِ مطلق اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت چلا رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ انسان کا وجود عناصر میں ظہورِ ترکیب کا فطری نتیجہ اور اس کی موت ان عناصر کا ناگزیر بگاڑ ہے، بالکل غلط ہے۔

قرآن مجید انسان کو اس دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے اور اُس سے اس بات کی توقع رکھتا ہے کہ وہ جس بلند وبالا ذات کا خلیفہ ہے اس کے منشا کو اس دنیا میں پورا کرے۔ چنانچہ اس نے انسان کی خلافت کے ساتھ اس امر کا بھی اعلان کیا ہے کہ جو کچھ اس زمین میں موجود ہے وہ اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے مسخر کرکے (سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ) اس سے استفادہ آسان بنا دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیات اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں کہ یہ زمین اور اس کے مادی وسائل انسان کے تابع ہیں اور انسان ان کے تابع نہیں۔ لہٰذا وہ سارے نظریات جن میں انسان کے بارے میں یہ مفروضے قائم کیے گئے ہیں کہ فرد اور معاشرے کے افکار و اعمال کی صورت گری ہر دور کے مادی اور معاشی حالات کرتے ہیں قرآن مجید کی رُو سے غلط ہیں۔ ان کے برعکس قرآنِ حکیم ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ انسان اس دنیا میں مادی ماحول کا غلام بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کا حاکم بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرکے ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرے جو خالقِ کائنات نے اس کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اس حقیقت کی وضاحت ملتی ہے کہ یہ دنیا اگرچہ انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر انسان خود خدا اور آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہی انسانیت کا مرجع و منتہا ہے۔ وَإِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ - وَإِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ - إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ - وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ - وَإِلَيْهِ مَآبِ کے الفاظ قرآن مجید میں بار بار آتے ہیں جو انسانی زندگی کے

حقیقی مقصد کی صاف الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو ایک تمثیل سے اس طرح واضح فرمایا ہے: الدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے" یعنی اس میں انسان کی محنت و مشقت اور اوزار و آلات سے استفادے کی غرض بجز اس کے اور کوئی نہ ہونی چاہیے کہ اس سے آخرت میں فلاح و کامرانی کی فصل کاٹی جا سکے۔

قرآن مجید کے اس تصور سے انسان کے بارے میں چند اور حقائق بھی سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسانی فکر و عمل کا محرک مادی نہیں بلکہ سراسر روحانی اور اخلاقی ہے۔ کیونکہ اگر یہ محرک مادی ہو تو پھر انسان کے لیے فطری طور پر یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کی بنا پر کسی دوسرے غیر مادی مقصد کے حصول کے لیے جد و جہد کر سکے۔

۲۔ دوسرے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان اس کائنات میں خالق کے منشا کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اخلاقی و روحانی مقاصد کی تکمیل کے لیے جد و جہد کرنے پر مامور ہے تو پھر اس سے یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے فکر و عمل میں کسی حد تک آزاد ہے۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان مادی قوتوں کے دباؤ کی وجہ سے ایک مخصوص طرز فکر اور طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور رہے تو پھر اس کے افکار و اعمال کی روحانی اور اخلاقی قدر و قیمت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بدی اختیار کرنے کے لیے آزاد اور خود مختار نہ ہو تو اس کی ذات اخلاقی صفت کے شیریں عنصر سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس تصور سے پھر یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ انسانی فکر و عمل میں آزادی ہی نے ہی حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کیا ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ دنیا میں کوئی فرد یا معاشرہ جو کچھ کر رہا ہے وہ خارجی حالات کا ناگزیر نتیجہ ہے تو اس میکانکی طرزِ عمل پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے؟ پھر بات یہاں تک ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ خیر و شر کے درمیان ساری تفریق ختم ہو جاتی ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ سارے انسانی افکار و اعمال مادی ماحول کا عکس ہیں تو اس اعتبار سے کسی نظریہ یا عمل کا مؤثر وجود ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے قوی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز غالب ہے وہی برحق ہے اور جو چیز

مغلوب ہے وہ باطل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق دنیا میں کسی طرزِ فکر یا طرزِ عمل کی بنیاد اس کا اخلاقی اور روحانی پہلو نہیں بلکہ عالمِ واقعات میں اس کی قوت اور طاقت کا مظاہرہ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے حاملین نے اپنی بات کو برحق منوانے کے لیے ہمیشہ اندھی بہری قوت سے کام لیا ہے اور اس امر کی کوشش کی کہ ہر جائز اور ناجائز طریق سے ان کے دلپسند افکار و نظریات کو دنیا میں بالجبر مسلط کیا جاسکے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسی تصور یا عمل کی غالب حیثیت ہی اس کی صحت کی سب سے بڑی شہادت فراہم کرتی ہے۔ اس بنا پر ان لوگوں نے ذرائع کے صحیح اور غلط ہونے کو ہمیشہ نظر انداز کر کے اس امر کی کوشش کی کہ جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو ان کی بات غالب ہو جائے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے جھوٹ، مکر و فریب اور تشدد سے کھلے بندوں کام لیا گیا اور اس معاملے میں کسی قسم کی کوئی معمولی خلش بھی محسوس نہ کی گئی۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ مقاصد ہی ذرائع اور وسائل کا جواز پیدا کرتے ہیں (ENDS JUSTIFY THE MEANS)۔ اگر مقاصد جھوٹ اور فریب سے حاصل ہوتے ہوں تو پھر عیاری ہی پسندیدہ اور قابلِ تعریف طرزِ عمل ہے۔ اور اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جبر مؤثر ہتھیار ثابت ہوتا ہو تو پھر تشدد کا یہ ذریعہ استعمال ہی صحیح اور انسب ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس طرزِ فکر کے علمبردار ہیں ان کے ہاں مقاصد کو ہمیشہ سازشوں، جوڑ توڑ، اور تشدد کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے اور کبھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے اخلاقی ضابطوں کی پابندی نہیں کی گئی۔

اس فلسفۂ حیات کا ایک اور المناک پہلو یہ ہے کہ خارجی ماحول کو غیر معمولی اہمیت دینے کی وجہ سے یہ غلط خیال ذہن میں بٹھا دیا گیا ہے کہ کسی صحت مند تبدیلی کے جذبات انسان کے اندر سے پیدا نہیں کیے جاسکتے انسان خارجی قوتوں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی ہے۔ اس لیے اس کی زندگی میں اگر کوئی انقلاب آسکتا ہے تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے خارجی حالات کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ دورِ جدید میں اصلاحِ حال کے سارے پروگراموں میں پورا زور خارجی حالات کے بدلنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اندر کے انسان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ قرآن مجید اس خیال کو باطل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسانی معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق کا کوئی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اندر کے انسان کی اصلاح

نہ کی جائے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس: ۹-۱۰)

کامیاب ہوگیا وہ جس نے نفس کو سنوارا اور نامراد ہوا جس نے اسے دبا دیا۔

یعنی جس نے نفس انسانی کو غلط رجحانات اور میلانات سے پاک صاف کرکے نیکی اور خدا پرستی کے جذبات سے معمور کیا وہ فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہوا، اور جس نے نفس کے اندر بھلائی کو نشوونما دینے کے بجائے اُلٹا اسے دبا دیا وہ فلاح سے محروم ہوگیا۔ کلامِ الٰہی میں تزکیۂ نفس کو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے اوّلین مقاصد میں شمار کیا گیا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ-۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

- اصلاحِ نفس انبیاء علیہ السلام کے فرائض میں داخل ہے اور اُن پر اس بات کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انسان کے خارجی حالات میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے سے پہلے انسانی نفوس کو اندر کی آلائشوں سے پاک کریں، انہیں غلط رجحانات سے ہٹا کر نیکی اور خدا ترسی کی راہ پر ڈالیں اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق و کردار کو خدا پرستی کی بنیاد پر اُستوار کریں۔ کیونکہ جب تک دل کی دنیا میں کوئی خوشگوار انقلاب نہیں آتا اس وقت تک خارجی ماحول میں کوئی صحت مند تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ خارج کی تبدیلی کے لیے کوئی اسکیم چاہے کتنی ہی شاندار بنا لی جائے، اگر اندر کا انسان بگڑا ہوا ہو تو وہ بہتر سے بہتر اسکیم کو بھی غارت کرکے رکھ دیتا ہے۔

نقطۂ نظر کے اس اختلاف کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے طریقِ انقلاب اور مادہ پرستوں کی انقلابی سرگرمیوں کے درمیان نہایت واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ خدا کے رسول اور ان کے متبعین کی پہلی

توجہ اصلاحِ باطن کی طرف مبذول ہوتی ہے اور وہ تلقین اور ترغیب کے ذریعے اور خود اپنی پاکیزہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کرکے انسانوں کے قلب و دماغ میں نیکی اور پرہیز گاری، خدا خوفی اور شرافت کے نیک احساسات و جذبات پیدا کرتے ہیں اور پھر ان جذبات کی بنیاد پر خارجی ماحول کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقِ انقلاب کے علمبرداروں کی زیادہ تر کوشش تعلیم و تبلیغ اور اصلاحِ نفوس پر صرف ہوتی ہے اور اس امر کا پوری طرح اہتمام کیا جاتا ہے کہ جس پاکیزگی اور خدا ترسی کو انسان نے داخلی طور پر قبول کیا ہے اسے خارجی زندگی میں تسلیم کرلیا جائے تاکہ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی دونوں اطاعتِ خداوندی کا نمونہ پیش کریں اور اس بنا پر ان دونوں کے درمیان مکمل مطابقت اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

ان گذارشات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقِ انقلاب میں قوت کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ کے رسولوں نے ضرورت کی حد تک اور احوال کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے قوت سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ قوت وہ آخری ہتھیار ہے جس سے ان حضرات نے اُس حالت میں کام لیا ہے جبکہ اصلاحِ نفوس کی کوششوں کے باوجود عملاً اصلاح میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔ انہوں نے اپنی بیشتر قوتیں اور صلاحیتیں لوگوں کے قلب و دماغ میں خداوند تعالیٰ کی عظمت کا نقش بٹھانے اور ان کے اندر احساسِ جوابدہی پیدا کرنے میں صرف کیں۔ حق کو واضح کرنے، اسے ذہن نشین کرانے اور حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے اور پھر انسان کو خود اپنی رضا سے حق کی طرف مائل کرنے کے لیے جس قدر بھی کوششیں کی جاسکتی تھیں، انھوں نے ان میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس راہ کے سارے مصائب کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت کیا اور ساری مزاحمتوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنے مقدس مشن کو جاری رکھا۔ لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ظالم اور بدقماش لوگ قوت کے بل بوتے پر انسان کی خدائی مسلط کرنے پر اور ان کی خواہش اور آرزو کے باوجود وہ انہیں جھوٹے خداؤں کی گرفت سے آزاد نہ ہونے دے رہے ہوں تو اس وقت شیاطین کے چنگل سے ان مظلوموں کو نکالنے کے لیے قوت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یوں عام حالات میں دینی اور اخلاقی نظام قولی اور عملی تبلیغ کے ذریعے ہی انسانوں کے اندر نفوذ و سرایت

کرتا اور پروان چڑھتا ہے۔

کسی مادّی اور اخلاقی نظام میں یہ فرق درحقیقت اُس بنیادی نقطۂ نظر کا مظہر ہے جو کوئی نظام انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ اسلام پوری نوع بشری کو ایک وسیع برادری سمجھتا ہے کیونکہ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد اور ایک ہی خالق کے عیال ہیں۔ اس بنا پر ان کے درمیان فطری طور پر محبت اور یگانگت ہونی چاہیے اور اگر وہ اس کے برعکس نفرت اور حسد کے جذبات پالتے ہیں تو وہ درحقیقت اپنی فطرت سے انحراف کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، ایک دوسرے سے تعاون اور ایک دوسرے کی بے لوث خدمت انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ یہ وہ مثبت اور تعمیری صفات ہیں جو انسانوں کے اجتماعی تعلقات کو وجود میں لانے کے لیے انتہائی ضروری ہیں اسی لیے انسان ہمیشہ سے ان صفات کو بہترین انسانی صفات سمجھتا رہا ہے — اور قرآن و حدیث میں بار بار خدا کے بندوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس دنیا میں انسانوں بلکہ حیوانوں کے ساتھ بھی بھلائی کا سلوک کرو، ایک دوسرے کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو، آپس میں خیر خواہی کا رویّہ اختیار کرو، انسانوں کے درمیان حق و صداقت اور عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو اور کسی دشمن کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ ظلم و ناانصافی کرنے لگو۔ دنیا میں جب کبھی بھی دینی اور روحانی نظام قائم ہوئے تو معاشرے میں انسانی ہمدردی اور محبت کے چشمے اُبل پڑے اور ہر انسان نے دوسرے انسان کا دمساز اور رفیق بن کر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔

اس کے برعکس مادی نظام اجتماعی تعلقات کی نہایت بھیانک توجیہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی فطرت کا ہیولیٰ خود غرضی، باہمی عناد اور کشمکش اور دشمنی سے تیار کیا گیا ہے۔ انسان کے وہ اعمال جو بظاہر اس کے جذبۂ ایثار اور ہمدردی کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی تہ میں بھی صرف خود غرضی ہی کارفرما ہوتی ہے۔ انسان مادی خواہشات اور لذتوں کا غلام ہے اور ان کے حصول کی خاطر ہی وہ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ ان مادی تمناؤں کے سوا وہ کوئی دوسری تمنائیں نہیں رکھتا اور ان حیوانی مقاصد کی تکمیل کے سوا اس کے سامنے

کوئی دوسرے مقاصد نہیں ہوتے۔ وہ دنیوی فائدوں ہی کے لیے جیتا ہے اور انہی کی آرزو میں مرتا ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے انسان اگر حیاتِ اجتماعی کا خواہشمند ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ابنائے نوع کے ساتھ مل کر آرام اور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، یا پاکیزہ اجتماعی زندگی میں روح کا سکون تلاش کرتا ہے، یا اجتماعی ماحول سے اُسے اخلاقی احساسات کو جِلا دینے کے مواقع میسّر آتے ہیں اور اس طرح اس کا جوہرِ انسانیت نکھرتا ہے بلکہ اس کی وجہ محض جذبۂ خود غرضی ہے۔ انسان کی مادّی خواہشات کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ دوسرے انسان اس کی حرص کی بھینٹ چڑھیں، لیکن اگر وہ معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف یا دیانت یا ہمدردی کرتا بھی ہے تو اس بنا پر کرتا ہے کہ ایسا نہ کرنے سے بالعموم اس کی اپنی اغراض کو نقصان پہنچتا ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر جب کسی نقصان کا خطرہ یا اندیشہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آدمی دوسرے کے ساتھ انصاف یا دیانت یا ہمدردی کرے۔

جس نظام میں خود غرضی کو اجتماعی زندگی کی اساس قرار دیا جائے اور جس میں انسان کو یہ باور کرایا جائے کہ حسّی خواہشات کے سوا اس کے دل میں کوئی دوسری خواہش موجزن نہیں ہو سکتی، اُس میں انسانوں کے درمیان کشمکش، مزاحمت، عداوت اور نفرت کا پیدا ہو جانا بالکل ناگزیر ہے۔ چنانچہ انسانیت کے اس تاریک تصور کے بطن سے اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے نظریات نے بھی جنم لیا ہے ان کی رُو سے انسان اور انسان کے درمیان اور انسانوں کے مختلف طبقات یا قوموں کے درمیان عداوت اور دشمنی حیاتِ اجتماعی کے لوازم ہیں۔ بلکہ ان نظریات کی روشنی میں پوری انسانی تاریخ ایک ایسے خوفناک کارزار کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں ہر انسان اور ہر طبقہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور نسلِ انسانی کا ہر فرد اور گروہ نہایت گھٹیا مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کو مٹانے کے درپے ہے اور اس باہمی آویزش اور دشمنی ہی سے نسلِ انسانی ترقی کی راہ پر آگے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یُوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان باہمی ایثار اور ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون انسانی فلاح و بہبود کی راہ نہیں ہے بلکہ حسد اور رقابت اور ایک دوسرے کے ساتھ سنگ دلانہ برتاؤ اور سرپھٹول ارتقاء اور ترقی کی راہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانوں اور گروہوں کے مابین لڑائی، جھگڑے ہوتے رہے ہیں اور خود غرض افراد نے بعض اوقات کمزور اور بے بس انسانوں کو حرص و آز کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ مگر انسانیت کے بارے میں یہ تصور بالکل غلط اور گمراہ کن ہے کہ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب ان صفات کو پسندیدہ انسانی صفات شمار کیا گیا ہو۔ اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کرنے کے بجائے ہمیشہ خود غرضی کا طرز عمل ہی اختیار کیا ہے اور دنیوی مفادات کے لالچ میں انسان ہمیشہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد ہی کرتے رہے ہیں۔ باری تعالیٰ نے انسان کو اچھے جذبات اور نیک احساسات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر عداوت و نفرت اس کی فطرت کے طبعی خواص نہیں بلکہ ذہنی عوارض ہیں۔ صحیح تعلیم و تربیت سے اور انسانیت کے اچھے نمونے سامنے لانے اور پاکیزہ ماحول کے میسر آنے سے ان عوارض کو دور کیا جاسکتا ہے اور اس طرح انسانی طبیعت کو اس کی فطری نیکی اور شرافت کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے۔ بلکہ بارہا چھوٹے یا بڑے پیمانے پر لوٹایا گیا ہے، اور انسانوں نے صدیوں ان لوگوں کو عزت کے ساتھ یاد کیا ہے جنہوں نے نوع انسانی کو بھلائی کی یہ راہ دکھائی ہے۔ مگر انسانیت کے بارے میں مادہ پرستوں کے گمراہ کن تصورات نے ذہنی عوارض اور اخلاقی بیماریوں کو انسان کی اصل فطرت قرار دے دیا اور خدا ترسی اور انسانی محبت کے فطری رجحانات کی یکسر تکذیب کر ڈالی۔ انسان کے ساتھ اس سے بڑی دشمنی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے متعلق یہ رائے قائم کر لی جائے کہ جنگ و جدال، دشمنی اور منافرت اس کے زندگی کے بنیادی عناصر ہیں اور نیکی اور بھلائی محض اعتباری اور ان ہونی باتیں ہیں۔

انسان کی فطری خود غرضی کے اس نظریہ نے کائنات کے بارے میں انسان کے تعلق کو بھی متاثر کیا ہے۔ آپ کسی موضوع پر اس نظریے کے حاملین کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو یہی تاثر ملے گا کہ فطرت کوئی ایسی اندھی بہری قوت ہے جو انسان پر تسلط قائم کرنے کے لیے بیتاب رہتی ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اس کے مقابلے میں انسان بھی ہر لمحہ اس بپھری ہوئی قوت پر غلبہ پانے

(باقی ص ۶۲ پر)

جماعت اسلامی پاکستان کا معاشی پروگرام

[ذیل میں مجلسِ عاملہ جماعت اسلامی کی وہ قرارداد درج کی جا رہی ہے جس میں وہ اصول بیان کیے گئے ہیں جن کی بنیاد پر ملک کے موجودہ معاشی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس قرارداد کو دیکھ کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جب ہم اسلام کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اِن مسائل کو حل کر سکتے ہیں تو ہمیں باہر سے کوئی نظریہ اور نظام درآمد کرنے کی کیا حاجت ہے؟ اور اس بات کی آخر کیا ضرورت ہے کہ جو اصلاحات ہم اپنے معاشی نظام میں بالکل اسلامی اصولوں کی بنیاد پر کر سکتے ہوں انہیں خواہ مخواہ "اسلامی سوشلزم" کے نام سے موسوم کیا جائے؟ اس غلط اصطلاح سے تو لامحالہ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اسلام میں کوئی نقص تھا جسے دُور کرنے کے لیے ہمیں سوشلزم کا پیوند لگانے کی ضرورت پیش آئی۔]

ہمارے مُلک میں اِس وقت جو معاشی نظام پایا جاتا ہے وہ صرف اِس وجہ سے ازسرتاپا ظلم بن گیا ہے کہ اِس میں سابق جاگیرداری نظام اور جدید سرمایہ داری نظام کی تمام بُرائیاں جمع ہو گئی ہیں، اور اُن پر ایک مُطلق العنان اور خود غرض بیوروکریسی کی بُرائیوں کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مجلسِ عاملہ جماعت اسلامی پاکستان مسلسل کئی روز تک اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جب تک اس پورے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں، یہاں عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا، مگر وہ تبدیلیاں لازماً ایسی ہونی چاہییں جن کے ساتھ افراد کے بنیادی حقوق، اور معاشرے کی شہری آزادیاں بھی برقرار رہیں، ورنہ ایک ظلم کی جگہ دوسرا عظیم تر ظلم قائم ہو جائے گا اور یہاں کوئی جمہوریت نہ چل سکے گی۔ لہٰذا اس مجلس کی رائے میں یہ مطلوبہ تبدیلیاں جن اصُولوں پر مبنی ہونی چاہییں وہ حسبِ ذیل ہیں:-

۱- سُود، سٹّہ، جُوا، اور دوسرے اُن تمام طریقوں کو، جنہیں اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے، قانُوناً ممنوع

کر دیا جائے اور صرف کسبِ حلال کے دروازے لوگوں کے لیے کھلے رکھے جائیں۔ نیز حرام طریقوں سے دولت صرف کرنے کے دروازے بھی بند کر دیے جائیں۔ صرف اسی طرح نظام سرمایہ داری کی جڑ کٹ سکتی ہے اور وہ آزاد معیشت بھی باقی رہ سکتی ہے جو جمہوریت کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ اب تک ناجائز اور حرام طریقوں اور ایک فاسد نظام کی غلط بخشیوں سے دولت کا جو انتہائی ظالمانہ ارتکاز ہو چکا ہے اس کا استیصال کرنے کے لیے اسلامی اصول کے مطابق اُن تمام لوگوں کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا جائے جن کے پاس دولت کا غیر معمولی اجتماع پایا جاتا ہے، اور وہ سب کچھ ان سے واپس لیا جائے جو حرام طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے۔

۳۔ ایک طویل مدت تک زرعی املاک کے معاملہ میں غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لیے شریعت کے اِس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیرِ اصلاح اختیار کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ اس قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے:

(الف) اُن تمام نئی اور پرانی جاگیرداریوں کو قطعی ختم کر دیا جائے جو کسی دورِ حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال سے پیدا ہوئی ہوں، کیونکہ ان کی ملکیت ہی شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔

(ب) قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد (مثلاً سو یا دو سو ایکڑ) تک محدود کر دیا جائے اور اس سے زائد ملکیت کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے۔ یہ تحدید صرف عارضی طور پر پچھلی ناہمواریاں دُور کرنے کے لیے کی جا سکتی ہے۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ مستقل تحدید صرف اسلامی قانون وراثت ہی سے نہیں بلکہ متعدد دوسرے شرعی قوانین سے بھی متصادم ہو جائے گی۔

(ج) تمام زمینیں خواہ وہ سرکاری املاک میں سے ہوں، یا مذکورۃ بالا دونوں طریقوں سے حاصل ہوئی ہوں، یا نئے بیراجوں کے ذریعہ سے کاشت کے قابل ہو گئی ہوں، ان کے بارے میں یہ قاعدہ طے کر دیا جائے کہ وہ غیر مالک کاشت کاروں، یا اقتصادی حد سے کم زمین کے مالکوں کے ہاتھ آسان اقساط پر فروخت کی جائیں گی، اور اس معاملہ میں قریبی علاقوں کے لوگوں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔ سرکاری لوگوں یا افسروں کو

سستے داموں بیچنے یا عطیے کے طور پر دے دینے کا طریقہ بند کر دیا جائے اور جن کو اس طرح زمینیں دی گئی ہیں ان سے واپس لے لیا جائے۔ نیز نیلام کے ذریعہ سے فروخت کرنے کا طریقہ بھی ترک کر دیا جائے۔

(د) مزارعت کے متعلق اسلامی قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے اور تمام غیر اسلامی طریقوں کو ازروئے قانون روک دیا جائے، تاکہ کوئی زمینداری ظلم کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

۴ - معاوضوں کے درمیان موجودہ تفاوت کو، جو ایک اور سو سے بھی زیادہ ہے، گھٹا کر فی الحال ایک اور بیس کی نسبت پر، اور بتدریج ایک اور دس کی نسبت پر لے آیا جائے۔ نیز یہ طے کر دیا جائے کہ کوئی معاوضہ اُس حد سے کم نہ ہو جو موجودہ زمانے کی قیمتوں کے لحاظ سے ایک کنبے کی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ بحالتِ موجودہ ڈیڑھ سو اور دو سو کے درمیان ہونی چاہیے، اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کم سے کم حدِ معاوضہ پر وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی کی جاتی رہنی چاہیے۔

۵ - کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان، علاج اور بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مناسب سہولتیں دی جائیں۔

۶ - تمام صنعتوں میں مزدوروں کو مذکورۂ بالا کم سے کم حدِ معاوضہ کے علاوہ نقد بونس بھی دیا جائے، اور بونس شیئرز کے ذریعہ سے انہیں صنعتوں کی ملکیت میں حصہ دار بنایا جائے، تاکہ جس صنعت سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کی ترقی سے ان کی ذاتی دلچسپی وابستہ ہو جائے، اور جس دولت کے پیدا کرنے میں ان کی محنت شامل ہے اس کے منافع میں بھی وہ حصہ دار ہوں۔

۷ - موجودہ لیبر قوانین کو بدل کر ایسے منصفانہ قوانین بنائے جائیں جو سرمایہ اور محنت کی کشمکش کو حقیقی تعاون میں تبدیل کر دیں، محنت پیشہ گروہ کو اس کے جائز حقوق دلوائیں، اور نزاعات کی صورت میں تصفیہ کا ایسا طریقہ مقرر کر دیں جو ٹھیک ٹھیک انصاف قائم کر سکتا ہو۔

۸ - ملکی قوانین اور انتظامی پالیسیوں میں اس طرح ترمیم و اصلاح کی جائے کہ صنعت و تجارت پر سے چند لوگوں کا تسلط ختم ہو اور معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد اُن کی ملکیت اور منافع میں حصہ دار بن سکیں۔ نیز قوانین اور پالیسیوں کی اُن تمام خامیوں کو دُور کیا جائے جن کی بدولت ناجائز نفع اندوزیاں کی جاتی ہیں، مصنوعی گرانی پیدا کر کے خلقِ خدا کے لیے زندگی بسر کرنا دشوار کر دیا جاتا ہے، اور ملک کی معاشی ترقی کا فائدہ عوام تک

نہیں پہنچنے دیا جاتا۔

۹۔ جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی ہاتھوں میں چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے ان کو قومی انتظام میں چلایا جائے۔ اِس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا ضروری ہے، ایک ایسی نمائندہ اسمبلی کا کام ہے جو عوام کی آزاد مرضی سے منتخب ہوئی ہو۔ اور اس کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ اطمینان کر لینا بھی ضروری ہے کہ ان صنعتوں کا انتظام بیورو کریسی کی اُن معروف خرابیوں کا شکار نہ ہونے پائے جن کی بدولت صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان کا موجب بن جاتا ہے۔

۱۰۔ بینکنگ اور انشورنس کے اُس پورے نظام کو، جو دراصل یہودی سرمایہ داروں کے دماغ کا آفریدہ ہے اور جس کی تقلید ہمارے ملک میں بھی کی جا رہی ہے، یکسر بدل کر اسلامی اصولِ شرکت و مضاربت اور تعاونِ باہمی کے مطابق از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ اِس بنیادی اصلاح کے بغیر ان دونوں چیزوں کے مفاسد کسی طرح دُور نہیں کیے جا سکتے خواہ ان کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔

۱۱۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے کفالتِ عامہ کی اُس اسلامی اسکیم کو عمل میں لایا جائے جس سے بہتر سوشل سکیوریٹی کی کوئی اسکیم آج تک کوئی نظام وضع نہیں کر سکا ہے۔ یہی ایک یقینی ذریعہ ہے جس سے ملک میں کوئی فرد غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہیں رہ سکتا۔

۱۲۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان عدمِ مساوات دُور کرنے کے لیے تحریکِ جمہوریت کے آٹھ نکاتی پروگرام میں سے اُن ۶ نکات پر عمل کیا جائے جو اس مسئلے کے متعلق تحریکِ جمہوریت نے بالاتفاق طے کیے تھے۔

اِن اصولوں پر معاشی اصلاحات کا ایک مفصل پروگرام مرتب کرنے کے لیے جماعت اسلامی کی ایک مخصوص کمیٹی کام کر رہی ہے جو عنقریب اپنی تجاویز پیش کر دیگی لیکن مجلسِ عاملہ یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ صرف معیشت ہی انسانی زندگی کا اصلی یا واحد مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ جب تک اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق اخلاق، معاشرت، تعلیم، سیاست، قانون، اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر اصلاحات نہ ہوں، محض معاشی اصلاح کا کوئی پروگرام بھی کامیاب اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ جماعت اسلامی اپنے منشور میں ان ہمہ گیر اصلاحات کا ایک تفصیلی نقشہ پیش کرے گی جو انشاء اللہ جلد ہی منظرِ عام پر آ جائے گا۔

مغرب کو اسلام کی دعوت

[۴ مارچ ۶۹ء کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "دنیا میں اسلام" (ISLAM IN THE WORLD) کے موضوع پر اٹلی کی ایک سرکاری ٹیلی ویژن کمپنی کو حسبِ ذیل انٹرویو دیا]

س : برصغیر میں اسلام کی آمد پر یہاں کے باشندوں کو کس چیز نے اپیل کیا ؟

ج - برصغیر میں اسلام پہلی صدی ہی میں آ گیا تھا پہلی صدی سے میری مراد پہلی صدی ہجری ہے۔ اس زمانے میں اسلام کو دو مذہبوں سے سابقہ پیش آیا۔ ایک بدھ مت، دوسرے ہندو مت۔ بدھ ازم ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو رہبانیت سکھاتا ہے۔ اور ہندو ازم ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے، ایسے مستقل طبقات میں جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ہندو ازم شرک و بت پرستی پر مبنی ہے۔ اسلام جب آیا تو اس نے یہاں ایک طرف توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ دوسری طرف اس نے طبقاتی تقسیم کو باطل ثابت کیا اور تمام انسانیت کی وحدت پر زور دیا۔ تیسری طرف اس نے انسان کو یہ بتایا کہ اس کی ترقی کا فطری راستہ ترکِ دنیا اور رہبانیت نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے خدا اور اس کے بندوں اور خود اپنے نفس کے حقوق ادا کرنا ہے۔ جو اثرات اسلام نے برصغیر کے باشندوں پر ڈالے ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جہاں اسلام کی آمد سے پہلے ایک مسلمان بھی موجود نہ تھا وہاں آج کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن کو اسلام کی تعلیمِ توحید نے وحدتِ انسانی کے تخیل نے، اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے پروگرام نے اپیل کیا۔

س - جدید دور کے لیے اسلام کا اجتماعی فلسفۂ حیات کیا ہے ؟

ج - اسلام کا اجتماعی فلسفۂ حیات ہر زمانے کے لیے ہے۔ وہ جدید دور کے لیے بھی اسی طرح صحیح اور درست ہے جس طرح قدیم دور کے لیے تھا اور آئندہ آنے والے ہزاروں سال کے لیے رہے گا۔ اس کا فلسفۂ حیات

اس تصور پر مبنی ہے کہ انسان کے لیے صحیح رویہ زندگی اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی و اطاعت اور اُس قانون کی پیروی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ چونکہ یہ ساری کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور انسان فطری طور پر اس کا بندہ ہے، اس لیے ہر زمانے میں انسانوں کے لیے صحیح رویہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی بندگی اور اطاعت کریں اور اُس قانون کی پیروی کریں جو اِس کائنات کے بنانے والے نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ یہی طریقِ زندگی ہر زمانے کے لیے ٹھیک، صحیح اور درست ہے۔ جب کبھی انسان نے اِس سے انحراف کیا، اُس کو ایسے پیچیدہ مسائل سے سابقہ پیش آیا جن کو وہ اپنی عقل سے کبھی صحیح طور پر حل نہ کر سکا۔ موجودہ دور میں جو تمدن اور تہذیب کا نظام پایا جاتا ہے وہ چونکہ خدا کی اطاعت سے منحرف اور اس کے قانون سے بے نیاز ہے، اس لیے اس نے بھی بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کے حل کرنے پر انسان قادر نہیں ہو رہا ہے۔

مثلاً، آج خاندانی زندگی کا نظام موجودہ تہذیب ہی کی وجہ سے درہم برہم ہو رہا ہے۔

مثلاً اسی تہذیب و تمدن کی بدولت رنگ اور نسل کے امتیازات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ دنیا میں کبھی انسانیت پر اتنا ظلم و ستم نہیں ہوا ہے جتنا اس رنگ و نسل کے امتیاز کی بدولت آج ہو رہا ہے۔

مثلاً اس تہذیب نے نیشنلزم کا طوفان برپا کر دیا جس کی بدولت دنیا میں دو عظیم الشان لڑائیاں ہو چکی ہیں اور مزید ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو ہے کہ انسان نے علومِ طبیعی کی طرح اپنی اجتماعی زندگی کے لیے بھی اپنی عقل ہی کو کافی سمجھ لیا ہے اور اپنی زندگی کا نظام اپنی عقل سے تصنیف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اُس فطری نظام کو اختیار کیا جائے، جو انسان کے لیے خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے تو یہ مسائل کبھی پیدا نہ ہوں اور اگر کبھی پیدا ہو بھی جائیں تو ان کو آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

س۔ نسل اور رنگ کا مسئلہ اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

ج۔ نسل اور رنگ کے مسئلے کے پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ آدمی محض اپنی جہالت اور تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ جو شخص کسی خاص نسل یا ملک یا قوم میں پیدا ہو گیا ہے وہ کسی ایسے شخص کے مقابلے

میں زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو کسی دوسری نسل یا قوم یا کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ آدمی کی پیدائش ایک اتفاقی امر ہے، اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسلام ایسے تمام تعصبات کو جاہلیت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان اور انسان کے درمیان فرق کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ اس کے اخلاق ہیں۔ اگر ایک انسان اعلیٰ درجے کے اخلاق رکھتا ہے تو خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ افریقہ میں پیدا ہوا ہو یا امریکہ میں یا ایشیا میں، بہرحال وہ قابل قدر انسان ہے۔ اور اگر ایک انسان اخلاق کے اعتبار سے ایک بُرا آدمی ہے تو خواہ وہ کسی جگہ پیدا ہوا ہو، اور اس کا رنگ خواہ کچھ ہی ہو اور اس کا تعلق خواہ کسی نسل سے ہو، وہ ایک بُرا انسان ہے۔ اسی بات کو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت اگر ہے تو وہ تقویٰ کی بنا پر ہے۔ جو شخص خدا کی صحیح صحیح بندگی کرتا ہے، اور خدا کے قانون کی صحیح صحیح پیروی کرتا ہے، خواہ وہ گورا ہو یا کالا، بہرحال وہ اس شخص سے افضل ہے جو خدا ترسی اور نیکی سے خالی ہو۔ اسلام نے اسی بنیاد پر تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹایا ہے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو ایک قرار دیتا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے سب کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ قرآن وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسان کے بنیادی حقوق کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے تمام انسانوں کو جو کسی مملکت میں شامل ہوں، ایک جیسے بنیادی حقوق عطا کیے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست چونکہ ایک نظریہ اور اصول (IDEOLOGY) پر قائم ہوتی ہے، اس لیے اس نظریہ کو جو لوگ مانتے ہوں اسلامی ریاست کو چلانے کا کام انہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اسے مانتے اور سمجھتے ہیں وہی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے اسلام تمام ان لوگوں کو یکساں تمدنی حقوق عطا کرتا ہے جو کسی اسلامی ریاست میں رہتے ہوں۔ اسی بنیاد پر اسلام نے ایک عالمگیر امت (WORLD-COMMUNITY) بنائی ہے جس میں ساری دنیا کے انسان برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ حج کے موقع پر ہر شخص جا کر دیکھ سکتا ہے کہ ایشیا، افریقہ، امریکہ، یورپ اور مختلف ملکوں کے لاکھوں مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں پایا جاتا۔ ان کو دیکھنے والا ایک ہی نظر میں یہ محسوس کر لیتا ہے کہ یہ سب ایک امت ہیں اور ان کے درمیان

کوئی معاشرتی امتیاز نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں رنگ و نسل کی تفریق کی بنا پر آج جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا یک لخت خاتمہ ہو سکتا ہے۔

س۔ شراب اور سُود کی حُرمت کے کیا وجوہ ہیں؟

ج۔ سب سے پہلے آپ شراب کے مسئلے پر غور کریں۔ علمی بنیاد پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ الکوہل انسان کے جسم کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور عقل کے لیے بھی۔ اس وقت دنیا میں الکوہلزم ایک خطرناک مسئلے کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جو اسی الکوہلزم کی بدولت عملاً اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کھو چکے ہیں اور معاشرے کے لیے ایک مسئلہ بن چکے ہیں۔ اس بات کو بھی مانا جاتا ہے کہ دنیا میں بکثرت حادثات (ACCIDENTS) اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ آدمی کے خون میں اگر ایک خاص مقدار میں الکوہل موجود ہو اور اس حالت میں وہ گاڑی چلائے تو اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی خطرہ بن جاتا ہے لیکن اس پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ وہ خاص مقدار کونسی ہے جس کا پایا جانا ذہنی توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ الکوہل ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو متوازن نہیں رہنے دیتی۔ اسی وجہ سے اسلام نے الکوہل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔ آج تک کوئی شخص یہ طے نہیں کر سکا ہے کہ کتنی مقدار میں الکوہل ہر شخص کے لیے مضر ہے اور کتنی مقدار میں غیر مضر۔ یہ نسبت مختلف انسانوں کے معاملہ میں مختلف ہوتی ہے اور کوئی ایسا قاعدۂ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ فلاں خاص مقدار تک الکوہل کا استعمال تمام انسانوں کے لیے یکساں غیر مضر ہو گا اور اس سے زائد مقدار سب کے لیے یکساں مضر ہو گی۔ اسی لیے اسلام نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کی کم سے کم مقدار بھی حرام ہے، کیونکہ اس کی کم مقدار کو حلال قرار دینے کے بعد کوئی خط ایسا نہیں کھینچا جا سکتا جہاں جواز کی حد ختم ہو سکے اور عدمِ جواز کی حد شروع ہو جائے۔ لہٰذا قابلِ عمل صورت یہی ہے کہ اس کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب یا نظامِ تہذیب ایسا نہیں ہے جس نے انسان کو الکوہلزم سے بچانے میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو اسلام نے حاصل کی ہے۔ امریکہ نے اسی صدی میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ امریکی قوم کو شراب کے نقصانات سے بچایا جائے۔ چنانچہ امریکی دستور میں ایک ترمیم کے ذریعے سے شراب کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ شراب کا سائنٹیفک بنیاد پر مضر ہونا پہلے ثابت ہو گیا تھا اور بعد میں

اس کا غیر مضر ہونا ثابت ہو گیا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امریکہ کی حکومت اور اس کا پورا قانونی نظام اپنا سارا زور لگا کر بھی لوگوں کو شراب چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ یہ دراصل امریکی تہذیب کے نظام کی کمزوری تھی۔ اس کے برعکس اسلام کا تہذیبی نظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک حکم مسلمانوں کو شراب سے روک دینے کے لیے کافی ہو گیا اور اس حکم میں آج تک اتنی طاقت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اب بھی شراب سے اجتناب کے معاملہ میں مسلمانوں کی برابری نہیں کر سکتی۔

جہاں تک سؤر کا تعلق ہے، تمام آسمانی شریعتوں میں وہ ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔ آج بھی بائیبل میں اس کی حرمت کا حکم موجود ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں آج سے سؤر کو حلال قرار دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیت نے بھی اُس حکم کو برقرار رکھا جو پہلے سے بائیبل میں سؤر کی حُرمت کے لیے موجود تھا۔ اگر سؤر کسی وقت بھی حلال کیا گیا ہوتا تو اس کا ثبوت موجود ہوتا کہ فلاں پیغمبر نے یا خدا کی فلاں کتاب نے اس کو حلال قرار دیا ہے۔ لیکن میرے علم میں نہیں ہے کہ کبھی خدا کی کسی کتاب میں اس کے حلال ہونے کا حکم آیا ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ سؤر کیوں حرام ہے؟ اس کے بارے میں یہ اصولی بات سمجھ لینی چاہیے کہ انسان اُن چیزوں کی بُرائی کو تو جان سکتا ہے جو جسمانی حیثیت سے اس کے لیے نقصان دہ ہوں۔ لیکن وہ آج تک کبھی یہ جاننے پر قادر نہیں ہوا ہے کہ کونسی غذائیں اس کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور روحانی حیثیت سے اس کے لیے نقصان دہ ہیں۔ غذاؤں کے اخلاقی اثرات جاننے اور ٹھیک ٹھیک ان کو متعین کرنے کے ذرائع انسان کو حاصل نہیں ہیں۔ اسی لیے یہ کام خدا نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ جو چیزیں انسان کے اخلاق اور اس کی رُوح کے لیے نقصان دہ ہیں ان کی نشاندہی وہ خود کر دے اور انہیں حرام قرار دے۔ اب اگر کوئی شخص خدا پر اعتماد کرتا ہو تو اسے وہ چیزیں چھوڑ دینی چاہییں جن سے اس نے منع کیا ہے، اور جو خدا پر اعتماد نہ رکھتا ہو وہ جو کچھ چاہے کھاتا رہے۔

ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دَورۂ تُرکی کے مشاہدات

از: جناب خلیل حامدی صاحب

(۳)

مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی مدرسہ امام وخطیب سے فارغ ہوکر دوستوں کی معیت میں واپس ہوٹل آیا اور ابھی ہوٹل کے دروازے پر ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ آج مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی ہے اور استنبول کے ایک سینما ہال میں ٹُرکی کی ایک کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے اِس موقع پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے، مجلس کا آغاز ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے اور مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ مَیں نے پہلے تو اِس پروگرام میں شرکت سے معذرت پیش کر دی لیکن نائف آفندی، پروفیسر عُزیر اور عبدالقادر سیزگین نے بشدّت اصرار کیا کہ مَیں اِس دعوت کو قبول کرلوں اور کچھ نہ کچھ ضرور اظہارِ خیال کروں۔ مجھے اظہارِ خیال سے تو گریز نہیں تھا۔ صرف یہ اُلجھن تھی کہ جس نوعیت کا یہ اجتماع ہو رہا ہے اور جس تنظیم کے اہتمام میں ہو رہا ہے وہ میرے ذوق اور رجحانِ طبع کے خلاف ہے۔ مگر دوستوں نے کہا کہ اِس اجتماع میں زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوں گے اور مجھے پُوری آزادی ہوگی کہ میں جو بات چاہوں، کہوں۔ لو ہر لحاظ سے دوستوں نے مجھے شرکت پر آمادہ کر دیا مگر بھی ایک اور رکاوٹ درمیان میں حائل تھی۔ وہ یہ تھی کہ اِس پروگرام کا ایک جُزء یہ بھی ہے کہ "درویشانِ حضرت مولانا" بربط و نَے کی دُھنوں پر "رقصِ مولوی" کا مظاہرہ کریں گے۔ خاکسار اِس "کلچرل شو" میں شریک ہونے پر دل کو مطمئن نہیں پا رہا تھا مگر بالآخر یہ طے ہُوا کہ جب یہ "شو" شروع ہو تو ہم اُٹھ آئیں گے۔

استنبول کے "فندیش" (GUNDES) سینما کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہے اور مرد و زن کا مخلوط جمِ غفیر موجود ہے۔ اکثریت نوجوان طلبہ اور طالبات کی ہے۔ کالجوں کے اساتذہ بھی شریک ہیں۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ عنصر بھی شریکِ محفل ہے۔ مرد تمام کوٹ اور پتلون سے آراستہ اور عورتیں بلا استثناء اسکرٹ اور منی اسکرٹ میں ملبوس۔ ہم اجنبی قدم قدم پر دوستوں کو کوستا رہا کہ کہاں لے کر آگئے۔ اور وہ برابر

تسلی دیتے رہے کہ کلمۂ حق ایسی ہی جگہوں پر بلند ہونا چاہیے۔

تعلیماتِ رومیؒ کے موضوع پر تقریر اسٹیج سکرٹری نے پروگرام کے افتتاح کا اعلان کیا۔ اور اعلان میں یہ بھی بتا دیا کہ اس اجتماع میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیرِ جماعت اسلامی پاکستان کے سکرٹری بھی تقریر کریں گے۔ اس اعلان پر جب تالیاں بجائی گئیں تو میں نے نائف آفندی سے پوچھا کہ حاضرین میں مولانا مودودی کو جاننے والے کتنے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یقیناً ان میں اکثر لوگ مولانا کو جاننے والے ہوں گے۔ الغرض قرآن پاک کی تلاوت کے بغیر ہی پروگرام کی طرح ڈال دی گئی۔ سب سے پہلے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر آف فلاسفی ڈاکٹر نورالدین صاحب نے مولانا رومیؒ پر ایک متوسط مقالہ پڑھا۔ ماسوائے چند فارسی اشعار کے راقم الحروف تو کچھ سمجھ نہ سکا البتہ ساتھیوں نے اس کی تعریف کی اور اس کے بعد میری باری آگئی۔ ماحول و اجتماع کی نامناسبت اور طبیعت کے انقباض کے باوجود میں نے اظہارِ خیال کی جرأت کر ڈالی۔ مترجم کی وساطت سے سب سے پہلے حاضرین کو میں نے پاکستان کے مسلمانوں کا سلام پہنچایا۔ ترک قوم کو پاکستان اور اہل پاکستان سے جو عمیق محبت بلکہ گرویدگی کی حد تک عقیدت ہے اُس کا اثر یہ تھا کہ پاکستان کا نام زبان پر آتے ہی حاضرین نے تالیوں سے ہال کو سر پر اُٹھا لیا اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا بھی کچھ حوصلہ بڑھ گیا۔ اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مولانا جلال الدین رومی اگرچہ قونیہ کے ایک بزرگ انسان تھے، مگر اُن کی دعوت اور تعلیم سے پورا عالمِ اسلامی آگاہ ہے۔ پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شخص اُن کی عقیدت کا دم بھرتا ہے۔ ان کی کتاب مثنوی دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ مولانا رومی کا مشن گوشہ نشین قوم تیار کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے عہدِ زوال میں آنکھ کھولی تھی اور ایک نبض شناس طبیب کی طرح انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ تاتاریوں کی یلغار کے سامنے سلجوقیوں کی پسپائی کا سبب یہ ہے کہ قوم کے اندر جہاد کی روح مضمحل ہو چکی ہے اور اخلاقی امراض اور دُنیا پرستی کی وبا نے ملتِ اسلامی کو کھوکھلا بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رُوم نے ملت کو جہاد پر اکسایا اور علماء کو سرزنش کی کہ علم کو اکتسابِ دنیا کا ذریعہ بنانے کے بجائے اُسے دین کے تقاضے پورے کرنے پر صرف کرنا چاہیئے۔ لفظ "جہاد" کا حاضرین نے خوب خیر مقدم کیا اور طویل تالیوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ جذبۂ جہاد تُرک قوم کی گھٹی

میں پڑا ہوا ہے جو نہ پہلے کسی کے نکالنے سے نکلا ہے اور نہ آئندہ نکل سکتا ہے۔

مولانا رومی کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ اگر ہم حضرت رومیؒ کی دعوت و تعلیم کو چند حرفوں میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ: مولاناؒ نے انسان کو توجہ دلائی کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اس کائنات میں اُس کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان نے جب کبھی اس اہم نکتے کو سمجھنے میں غفلت کی ہے تو وہ لازماً دو خرابیوں میں سے ایک نہ ایک خرابی میں مبتلا ہوا ہے۔ وہ انحطاط کی جانب لڑھکا ہے اور یا اُس نے استکبار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اور ان دونوں صورتوں میں اُس نے اپنی تباہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور دنیا کی تباہی کا موجب بھی بنا ہے۔

اوّل الذکر شکل میں انسان اپنے اصل مرتبہ و مقام سے نیچے گرتا ہے۔ اور دنیا کے اندر اپنا صحیح منصب سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کی بندگی کے بجائے وہ ہر دوسری مخلوق کو خالق ٹھیرانے لگتا ہے۔ کبھی آگ کو خدا مانتا ہے، کبھی حجر و شجر کے آگے سربسجود ہوتا ہے اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں کی خدائی ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ قومی لیڈروں کو خدائی کا درجہ دینے لگتا ہے۔ اُن کے خود ساختہ قوانین کو واجب الاتباع تسلیم کرتا ہے۔ اُن کی مطلق العنانی کے آگے گھٹنے ٹیکتا ہے۔ اُن کے مجسمے تراش تراش کر ہر اہم مقام پر نصب کرتا ہے۔ چونکہ یہ صورتِ حال امرِ واقع کے منافی ہے اس لیے اس سے دنیا کے اندر خرابی کی متعدد صورتیں جنم لیتی ہیں۔ اِس طرح ثانی الذکر شکل یعنی استکبار کا راستہ بھی غلط اور خلافِ فطرت ہے۔ اس شکل میں انسان اپنے اصل مقام کو فراموش کر کے اس وہم کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ خود خدا ہے اور "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" کا سودا اُس کے دماغ میں سما جاتا ہے۔ وہ یہ تصور کر بیٹھتا ہے کہ اس کائنات کا میں ہی مالک ہوں۔ میں آقا ہوں اور دوسرے غلام۔ میں حاکمِ اعلیٰ ہوں اور دوسرے میری رعایا۔ میں جو چاہوں قانون بناؤں اور جسے چاہوں ماروں اور جلاؤں۔ میں وہ ہوں کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ یہ راستہ بھی غلط نگاہی اور سودائے خام کی ایک ایجاد ہے۔ اور انسانی زندگی کے لیے سراسر موجبِ لعنت اور باعثِ ذلّت ہے۔ جہاں اس زعمِ باطل کا آغاز ہوا، فساد اور ہلاکت خیزی نے سر اٹھا لیا۔

انسان کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ یہ باور کرے کہ نہ وہ خود خالق ہے، نہ بغیر کسی خالق کے خود پیدا ہو گیا ہے، اور نہ خدا کے سوا کوئی دوسری ہستی یہ حیثیت رکھتی ہے کہ اُسے خالق اور معبود مانا جائے اور اُس کے

قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اللہ کے سوا انسان کا کوئی معبود نہیں ہے، اور اُس کے قانون کے سوا کسی قانون کی بالاتری درست نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ جو تعلیم انسان کو بھیجی ہے وہی انسانی زندگی کو اور انسانی تہذیب و تمدن کو اعتدال پر قائم رکھ سکتی ہے اور دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی کا فیصلہ کر سکتی ہے یہ ہے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کا حاصل۔ اور ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر ہم نے ان کی اِس تعلیم کو اپنے لیے حرزِ جان بنا لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین میرے تمام اشارے سمجھ رہے تھے۔ وہ ایک ایک جملے پر دل کھول کر اپنے ردِّ عمل کا اظہار کر رہے تھے۔ اور خود راقم الحروف بھی محوِ حیرت تھا کہ لادینی نظامِ تعلیم کے اندر تربیت پانے والے یہ نوجوان اور مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ پیش کرنے والے یہ مرد و زن اِس حد تک اسلام کے قریب آ رہے ہیں کہ انسانی حاکمیت پر واضح تنقید اور اللہ کی حاکمیت کی صریح دعوت کو نہ صرف سننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں بلکہ اُس پر بے پناہ تحسین کا اظہار کر رہے ہیں اور معنی خیز طریقے سے یہ تأثر دے رہے ہیں کہ اب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ انسان کی خدائی کی بساط لپیٹ جائے گی اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی شریعت کا ڈنکا بجے گا۔

ترکوں اور عربوں کا فرق

حاضرین کے اُچھلتے ہوئے جذبات کا اندازہ لگا کر میں نے اپنی بات کا رُخ بدل دیا اور خالص جذباتی رنگ میں عرض کیا: اے ترک بھائیو، اے سلطان محمد الفاتح کے وارثو، حضرت ابو ایوب انصاری کے پڑوسیو، سلطان عبدالحمید ثانی کے جانشینو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقو اور قرآن کے علمبردارو! تم نے ماضی میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اسلامی تاریخ کے اندر سنہری حروف میں ثبت ہو چکا ہے۔ اب پھر اللہ کا نام لے کر اٹھو اور عظمتِ رفتہ کو زندہ کر دکھاؤ۔ ویانا کی فصیلیں اور افریقہ و ایشیا کے جبال و صحرا پھر اُسی پرچم کو سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں جو اسلام کے غلبہ کی علامت تھا۔ ترکوں کے آخری عہد پر بڑی تنقیدیں کی گئی ہیں لیکن تنقید کرنے والوں سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے اِس کردار کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے اُسے دولت کے انبار پیش کیے گئے اور اُن کے عوض اُس سے صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ مگر سلطان نے یہ کہہ کر اس دولت کو ٹھکرا دیا کہ بیت المقدس کی سرزمین کی مٹی کی ایک مٹھی بھی میرے لیے تمہارے تمام انبارہائے

سیم وزر سے زیادہ قیمتی ہے فلسطین ہمارے آباؤ اجداد نے خون سے خریدا تھا اور ہم سے بھی خون کے عوض ہی خریدا جا سکتا ہے۔ اس کردار کے مقابلے میں دوسرا کردار یہ نظر آ رہا ہے کہ نہ صرف بیت المقدس بلکہ پورا فلسطین یوں یہودیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ گویا کسی سابقہ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اُسے تحفہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہو۔ میں اس موقع پر برملا اپنے اِس خیال کا اظہار کیے دیتا ہوں کہ فلسطین کو عرب ہرگز نہیں آزاد کرا سکیں گے۔ بلکہ انشاء اللہ اِسے ترک اور پاکستانی آزاد کرائیں گے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا نام اب ترکوں کے لیے بڑا محبوب نام ہے۔ مَیں نے جب اُن کا ذکر کیا تو اس پر خوب خوب حاضرین نے داد دی۔ اور یہ نکتہ کہ اب فلسطین کو ترک آزاد کرائیں گے اس قدر گرمجوشی کے اظہار کا مرکز بن گیا کہ طُورانی ترکوں کی وہ تمام کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں جو ترک ملت کے دلوں میں عربوں کے خلاف نفرت کا بیج بونے کے لیے اُنھوں نے صرف کی تھیں۔ کیونکہ طورانی قومیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تُرکوں کو عربوں کے کسی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترک اور عرب دو متضاد حقیقتوں کا نام ہے جو ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ مگر اب تُرک نوجوان قبلۂ اوّل، حرم ثالث اور سرزمین انبیاء کے ساتھ گہری وابستگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسے یہودیوں سے آزاد کرانے کے لیے بیتاب ہے۔

میری مختصر تقریر ختم ہوئی تو اس اجتماع کا آخری پروگرام شروع ہو گیا۔ اور "رقصِ مولوی" کا تماشا تو نہ ہوا البتہ مثنوی کو چند نوجوانوں نے بربط و نے کی آواز پر سنایا۔ محفل کے اختتام پر دوستوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ حاضرین کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق نکلا۔ بظاہر اسلام کی بات ان کے آگے کرنا لاحاصل معلوم ہوتا تھا مگر درحقیقت اِن کے ذہن اِسلام کے لیے وا ہو رہے ہیں۔ ہال کے اندر ہمارے پرانے دوست عیسیٰ یُوسف الپتگین بھی مل گئے۔ موصوف مشرقی ترکستان (جسے اب سنگ کیانگ کا نام دے دیا گیا ہے) کی حکومت کے چیف سیکرٹری رہ چکے ہیں اور چین کے سُرخ استبداد نے جب ترکستانی مسلمانوں پر مظالم توڑے تو یہ ہجرت کر کے تُرکی میں پناہ گزین ہو گئے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو اور کچھ نہ کچھ انگریزی بول لیتے ہیں۔ اور اب نیشنل سنٹر آف ایسٹرن ترکستان کے پریذیڈنٹ ہیں اور مشرقی ترکستان کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ مولانا محترم کے ساتھ بڑی محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ مَیں کل ہوٹل میں آکر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

سیرِ استنبول اجتماع سے فارغ ہو کر سب دوستوں کے ہمراہ واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے نائف آفندی سے کہا کہ میری وجہ سے آپ حضرات کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ میں آپ لوگوں کے نجی مشاغل میں حارج ہو رہا ہوں۔ میری اس ندامت کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ہم ابھی آپ کو استنبول کی گشت کروانا چاہتے ہیں۔ استنبول کے دن تو بلاشبہ کیف آور ہیں مگر استنبول کی راتیں بھی بڑی روح پرور اور نشاط آگیں ہیں۔ اور خصوصاً رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں استنبول کا منظر دیدنی ہے۔ مسجدیں بقعۂ نور بن رہی ہیں۔ ان میں قرآن خوانی کی محفلیں جم رہی ہیں۔ روحانی مناظر کے علاوہ استنبول کے قدرتی مناظر بھی بڑے دلکش اور دیدہ نواز ہیں۔ احباب کی اس پیش کش کو غنیمت جانا کہ اتفاق سے استنبول کی سیاحت کا یہ موقع میسر آگیا ہے اور وہ بھی رمضان کے بابرکت اور روح پرور مہینے میں۔ مدتوں سے سُن رہے تھے کہ ترکی کا رمضان بڑا پُر رونق اور کیف بداماں ہوتا ہے۔ اس بات نے زیارتِ ترکی کی آرزو کو شدید تر کر رکھا تھا اور اب بحُسنِ اتفاق یہ آرزو بروئے کار آرہی ہے۔ اس خاکسار کی حیثیت کیا ہے۔ دوستوں کے یہ جذباتِ اُلفت و محبّت، اور سعادتوں کی یہ بارش صرف مولانا مودودی مدظلہ العالی سے نسبت کی وجہ سے ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

استنبول میں داخل ہونے سے قبل اس کا مجموعی نقشہ سمجھ لیں تاکہ اس تاریخی شہر کی مرکزی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے ہمیں استنبول کی تفریح گاہوں اور ساحلی مقامات سے کوئی تعرّض نہیں، نہ اس کے چشمے اور خیابان ہمارے لیے وجہِ کشش ہیں، اور نہ اس کے کوچہ و بازار موضوعِ سخن۔ کہا جاتا ہے استنبول "موطن العجائب" ہے "عروس المشرق" ہے، تحفۂ فطرت ہے۔ حجاز کی شاہراہوں پر یہ فقرے جگہ جگہ بجلی کے بورڈوں پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ بے شک یہ درست ہے۔ استعماری اقوام اس کے جمالِ طبعی اور سحر طرازی پر ہمیشہ رال ٹپکاتی رہی ہیں عام سیاح بھی استنبول کی پُرکیف تفریحات اور وہاں کے سُنبل و ریحاں اور سمندر کی امواجِ بیچاں کو مرکزِ نگاہ بناتے ہیں۔ خود ترکی کے ادارہ ہائے سیاحت بھی دنیا کو یہی دعوت دیتے ہیں کہ حسین خوابوں کی تعبیر کے لیے استنبول کا مشاہدہ کیا جائے۔ مگر ہماری نگاہِ جستجو جس بات کی ٹوہ میں تھی وہ یہ کہ جو شہر پہلے بازنطینی کلیسا کی راجدھانی تھا اور پھر اسے اسلامی خلافت کا مرکز بننے کی سعادت ملی اور وہ تقریباً ۵ سو سال تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کا آستانہ بنا رہا، اب وہ اپنی اس پچھلی تاریخ کی کس حد تک نمائندگی کر رہا ہے؟ خاتمۂ خلافت اور لادینی استبداد کے تسلط نے اس کے رنگ

ڈھنگ میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے۔ اور کیا اب ہم یہ توقع باندھ سکتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی یہ شہر اسلام کا ناقابلِ شکست حصارین جائے اور کوئی نیا محمد الفاتح اٹھ کر ملحدانہ تہذیب کی حکمرانی کے بجائے اس پر اسلامی تہذیب کا سکّہ رواں کر دے؟

استنبول کی جغرافیائی اہمیت | استنبول کی جغرافیائی ساخت بڑی دلچسپ ہے۔ بنیادی طور پر یہ دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک ایشیائی حصّہ اور دوسرا یورپی حصّہ۔ ان دونوں حصّوں کو آبنائے باسفورس باہم جُدا کرتی ہے۔ آبنائے باسفورس کا شمالی سرا بحرِ اسود سے ملتا ہے اور جنوبی سرا بحرِ مرمرا سے۔ آبنائے باسفورس کی کل لمبائی ۲۶ میل ہے اور چوڑائی کسی مقام پر ۵ میل تک پہنچی ہوئی ہے اور کسی مقام پر صرف ایک میل۔ شمال سے جو جہاز بحرِ اسود سے نکل کر آبنائے باسفورس میں داخل ہوگا وہ استنبول کے دونوں حصّوں کے بیچوں بیچ آبنائے باسفورس کو چیرتا ہوا جنوب میں بحرِ مرمرا کے پانی میں اتر جائے گا اور بحرِ مرمرا کو عبور کرتا ہوا درّہ دانیال سے نکل کر بحرِ ایجین کے سینہ پر سوار ہو جائے گا۔ بحرِ ایجین سے بحرِ ابیض میں داخل ہونے کے لیے اُسے لازماً درّہ دانیال سے گزرنا پڑے گا۔ اس طرح بحرِ اسود سے بحرِ ابیض میں جانے کے لیے ہر جہاز کو پہلے آبنائے باسفورس سے گزرنے کی اجازت لینی پڑے گی، کیونکہ اگر استنبول اُسے پروانہ راہداری نہیں دے گا تو وہ کسی طور آبنائے باسفورس سے نہیں گزر سکتا۔ اور اس کے بعد درّہ دانیال بھی ایسی تنگ آبنائے ہے کہ حکومت ترکی سے باقاعدہ اجازت لیے بغیر وہاں سے بھی عبور محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کا بحری بیڑا صدیوں سے بحرِ اسود کے ٹھنڈے پانیوں سے نکل کر بحرِ ابیض کے گرم پانیوں میں اشنان کرنے کے لیے غلطاں و پیچاں رہا۔ مگر ترکوں نے اُسے گزرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ اور اب ترکی تاریخ میں پہلی مرتبہ عرب و اسرائیل کی جنگ جون ۶۷ء میں روسی بحری بیڑے نے گرم پانیوں کا مزہ چکھا ہے۔ یہ ترکی حکومت کا بہت بڑا اقدام ہے کہ اُس نے جس بیڑے کو صدیوں تک یہاں سے گزرنے کی اجازت نہ دی بالآخر اُسے عربوں کے مفاد کی خاطر اپنی تاریخی عداوت اور ناقابلِ تغیر روایت کو تج دینا پڑا۔ اس کی تہ میں صرف اسلامی اخوت کا محرک کام کر رہا ہے۔ ورنہ ترک قومیت اور عرب قومیت کے درمیان جنگِ عظیم اوّل میں جو منافر پیدا ہو چکا تھا وہ اس قدر شدید تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے تھے مگر یہ دونوں قومیتیں باہم مصافحہ نہیں کر سکتی تھیں۔

ایشیا اور یورپ کا نقطۂ انصال | یوں آبنائے باسفورس بحرِ اسود اور بحرِ ابیض کا درمیانی واسطہ بھی ہے اور ایشیا

اور یورپ کے مابین حلقۂ اتصال بھی۔ ترکی کا جو علاقہ ایشیا میں ہے وہ اناضول یا اناطولیہ کہلاتا ہے اور جو ایشیا میں ہے اُسے رومیلی بھی کہتے ہیں اور تراقیا (THRACE) بھی۔ تمام دنیا کے شہروں میں استنبول کی یہ نرالی شان ہے کہ اس کی نصف آبادی ایشیا میں رہتی ہے اور نصف یورپ میں۔ استنبول یورپ اور ایشیا کا جغرافیائی پل ہی نہیں ہے بلکہ دونوں براعظموں کے درمیان تہذیبی، تمدنی اور تاریخی پل بھی ہے۔ استنبول کا یورپی حصہ بھی جنوبی سمت میں دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان آبنائے باسفورس کے بطن سے نکلی ہوئی ایک خلیج ۵ میل تک اندر چلی گئی ہے۔ ترک اس خلیج کو شاخ زریں (گولڈن ہارن) کا نام دیتے ہیں۔ اس خلیج پر دو پل قائم ہیں۔ جن سے عام آبادی صبح و شام اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتی رہتی ہے اور کسی سے عبور کرنے کا ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ ان میں سے ایک پل رات کو اٹھا دیا جاتا ہے تاکہ جہاز گزر سکیں۔ دوسرا پل سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوایا تھا۔ اُس نے اسے نہایت کشادہ رکھا۔ اس پر لوگوں نے سلطان کو غلط اندیش کہا۔ مگر اب آبادی کے ہجوم اور ٹریفک کے اژدحام نے خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ سلطان دُور اندیش تھا۔ اگر اتنا کشادہ پل نہ بناتا تو وہ موجودہ ٹریفک کا ہرگز متحمل نہ ہوتا۔ یورپی حصے کے دونوں منطقوں کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک کا نام فاتح ہے جو جنوب میں ہے۔ اور محمد الفاتح کے نام منسوب ہے۔ آیا صوفیہ اسی میں واقع ہے۔ اور دوسرے کا نام بیوغلو ہے۔ یہ بھی بہت قدیم نام ہے جو درحقیقت اس منطقے کے ایک بڑے محلّے کا نام تھا۔ اور پورے منطقے کو بھی اسی نام سے موسوم کر دیا گیا۔ استنبول کے ایشیائی حصے کو اسکودار یا قاضی کوئی کہتے ہیں۔ دونوں پرانے تاریخی نام ہیں۔ یہ تینوں حصے (ایشیائی حصہ اور یورپی حصہ کے دونوں منطقے) اب استنبول کہلاتے ہیں۔ ورنہ ماضی میں یورپی حصہ الگ شہر تھا، اور اُسے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا اور ایشیائی حصہ اسکودار تھا۔ عثمانی سلطان بایزید اوّل یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) نے جب پہلی مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو اُس وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔ اور جب محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں اس شہر کو پوری طرح زیرنگین کیا تو زبانِ خلق نے اُسے احتراماً اسلامبول پکارا یعنی اسلام کی عظمت و کثرت کا نشان۔

استنبول کی تاریخ پر ایک نظر عثمانی سلاطین کے جو کارنامے تاریخ نے سنہری قلم سے لکھے ہیں ان میں سرفہرست یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے ۱۴۵۳ء میں بازنطینی سلطنت کے اس مرکز کو فتح کر کے قلمروِ اسلام کا ایک جزء بنا دیا۔ اور پھر یہاں سے یورپ میں اسلام کا داخلہ شروع ہو گیا، اور ویانا کی فصیلوں نے پرچم اسلام کو بوسہ دیا۔

قسطنطنیہ کی بنیاد بازنطیم (BYZANTIUNM) کے نام سے ۶۵۸ قبل مسیح رکھی گئی۔ اس کے بانی اول کا نام بنراس بتایا جاتا ہے جو ان یونانی اقوام کا ایک بادشاہ تھا جو ۶۵۸ قبل مسیح میں یہاں آکر آباد ہوئی تھیں۔ بادشاہ مارکس اور بلیوس کے عہد میں اس شہر کا نام اُس کے نانا انطونیون کے نام پر رکھ دیا گیا۔ بعد میں انطونیون سے بدل کر بیزنطا اس کا نام پڑا۔ اور آخر کار ۳۳۰ء میں رومی بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو رومی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام قسطنطنیہ مشہور ہوا۔ بادشاہ قسطنطین نے اِس شہر کو روما کے طرز پر تعمیر کرنا چاہا۔ اس کے اردگرد ایک بہت بڑی فصیل کھینچی جس کے بعض حصے اب تک باقی ہیں۔ استنبول کے ہوائی اڈہ سے جو شخص شہر میں داخل ہوگا اِس فصیل کے شکستہ و منہدم حصے اُس کا استقبال کریں گے۔ تھیوڈوسیس کے بعد یہ شہر مشرق کی رومی امپائر کا پایۂ تخت بنا، یہاں تک کہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ۵۳ دنوں کے محاصرہ کے بعد سلطان محمد الفاتح نے اسے فتح کرلیا اور یہ صلیب کے بجائے ہلال اور تثلیث کے بجائے توحید کا نشان بن گیا۔

اس شہر کے وجود میں آنے کے بعد سلطان محمد الفاتح کے عہد تک انتیس بار اِس کا محاصرہ ہوا لیکن صرف آٹھ مرتبہ حملہ آور فوج اس کے اندر داخل ہوسکی۔ مسلمانوں نے گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ہے۔ مُسندِ امام احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لتفتحن القسطنطینة، فلنعم الامیر امیرھا ولنعم الجیش جیشھا۔ (تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرلوگے، اس شہر کا امیر بھی خوب ہوگا، اور یہ فاتح فوج بھی خوب ہوگی)۔ نیز بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اُسے بخش دیا ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشین گوئی کے یقین پر اور اس سعادت و مغفرت کی طلب میں بارہا مسلمان مجاہدین نے اس شہر کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس میں بہت سے صحابۂ کرام نے شرکت فرمائی مثلاً حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت ابوالدرداء وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اس کے بعد عہدِ صحابہؓ میں دو مرتبہ اور محاصرہ کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ خلافت میں چوتھی مرتبہ مسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ پانچواں حملہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں ہوا۔ چھٹا عہدِ عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیرِ قیادت ہوا، اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار

عبدالملک نے ۱۸۲ھ (۷۹۸ء) میں کیا۔ عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی۔ پہلے جس عثمانی حکمران نے قسطنطنیہ کی فتح کا عزم کیا وہ سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) ہے۔ اس سلطان نے دو مرتبہ قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی۔ اس کا پہلا محاصرہ سات ماہ تک قائم رہا اور بالآخر قسطنطنیہ کے حاکم مینوئل کے ساتھ سلطان نے دس سال کے لیے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس صلحنامہ میں دوسری متعدد شرائط کے علاوہ سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراؤن مقرر ہوئی نیز مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جس میں سلطان بایزید نے ترکی قاضی مقرر کیا۔ کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی جو اس شہر کی پہلی مسجد کہلاتی ہے اور موجودہ استنبول یونیورسٹی کے قریب ہے ـــــ یونان میں فتوحات حاصل کرنے کے بعد سلطان بایزید یلدرم نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ سلطان قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ تیمور لشکر جرار کے ساتھ ایشیائے کوچک میں داخل ہو گیا اور سلطان بایزید کو محاصرہ اٹھا کر تیمور کے مقابلے پر جانا پڑا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قسطنطنیہ کی فتح ملتوی ہو گئی بلکہ سلطان بایزید کی شکست سے خود عثمانی سلطنت بھی شدید تباہی سے دوچار ہو گئی۔ اگر تیمور اور بایزید کے میان اس وقت تصادم نہ ہوتا تو قسطنطنیہ ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) ہی میں مسلمانوں کے ہاتھ آجاتا۔ بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ مہم پایۂ تکمیل تک پہنچانی چاہی لیکن اپنے بھائی شہزادہ محمد کے ساتھ اس کی نزاع نے فتح قسطنطنیہ کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر رومی شہنشاہ نے اظہارِ اطاعت کیا۔ اور سلطان نے اس سے متاثر ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ غرض سلطان محمد ثانی، جسے بعد میں محمد الفاتح کہا گیا، سے پہلے مجاہدینِ اسلام گیارہ مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے۔ لیکن کامیابی کا سہرا محمد الفاتح کا منتظر تھا۔ صحابۂ کرام کے مقدس خون نے جس مہم کی طرح ڈالی تھی اس کا تکملہ اسی نوجوان عثمانی ترک کی تلوار سے صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہونے والا تھا۔ محمد الفاتح نے اسے عثمانی قلمرو کا دارالحکومت بنایا۔ ۴۶۷ سال تک یہ عثمانیوں کا مرکز رہا۔ مگر ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال نے اس کی یہ حیثیت ختم کر دی اور اس کے بجائے انقرہ کو ترکی کا صدر مقام قرار دے دیا۔

رمضان کا خیر مقدم پروفیسر عزیز، نائلہ آفندی اور شیخ یوسف کے ہمراہ استنبول کی سیرِ شبانہ کو نکلے۔ موٹر شیخ یوسف کی تھی۔ خود ہی اسے چلا رہے تھے۔ شیخ یوسف بھی بڑے دلچسپ اور زندہ دل آدمی ہیں۔ پاکستان دیکھ چکے ہیں

بتانے لگے کہ تبلیغی جماعت کے ہمراہ انہوں نے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں گشت کی ہے۔ پاکستانیوں کے اخلاق اور دینداری کے بڑے مداح ہیں۔ دوبارہ پاکستان آنے کا عزم وشوق رکھتے ہیں۔ تجارت پیشہ ہیں۔ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی دونوں کی محبت سے لبریز ہیں۔

رات کا وقت ہے۔ استنبول کی شاہراہیں قمقموں سے جگمگا رہی ہیں۔ سردی اگرچہ شدید ہے مگر بایں ہمہ بازاروں میں بڑی رونق ہے۔ رمضان المبارک کا عشرۂ آخر ہے۔ خریداری کا عروج ہے۔ عید کی خوشی اور مسرت سے ہر شخص جھوم رہا ہے۔ مسجدوں کے مینار بجلی کے قمقموں سے سج رہے ہیں۔ ہر مسجد بقعۂ نور ہے۔ ہر مسجد میں تلاوت قرآن پاک ہو رہی ہے۔ رات کی مسحور کن فضا میں قرآن کا نغمۂ سرمدی دلوں کی دنیا میں عجب بے خودی پیدا کر رہا ہے۔ ترکوں کی قرآن خوانی ضرب المثل ہے۔ مصری بھی اس میدان میں کم نہیں مگر مصریوں میں تصنّع اور ترکوں میں بے ساختگی ہے۔ یہاں مسجد کی تزئین میں ایک نرالی بات دیکھی۔ ہر مسجد کی پیشانی پر قمقموں کا ہالہ تنا ہوا ہے جسے مُحیّا کہتے ہیں۔ یہ خالص عربی لفظ ہے جس کا معنیٰ ہے چہرہ مُہرہ۔ ہر مسجد کا اپنا الگ مُحیّا ہے جو قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ٹکڑے پر مشتمل ہے۔ مثلاً ینی جامع کا مُحیّا یہ ہے کہ "بزرگی و برتری صرف اللہ کے لیے ہے"۔ مسجدوں کی تزئین و تنویر رمضان المبارک کی خوشی کا ایک مظہر ہے۔

بیوغلو کی حالت میں جس علاقہ میں مقیم ہوں یہ یورپی حصہ کا وہ منطقہ ہے جسے فاتح کہتے ہیں۔ ہم اس منطقہ سے نکل کر غلطہ پُل کے ذریعہ خلیج گولڈن ہارن کو عبور کرنے کے بعد دوسرے منطقہ یعنی بیوغلو میں چلے گئے۔ فاتح میں مسجدوں کی کثرت ہے اور بیوغلو میں مسجدیں کم ہیں۔ بیوغلو خوشحال، تجارت پیشہ اور اہلِ ثروت لوگوں کا منطقہ ہے۔ اس منطقہ کا سب سے نامور محلّہ "تقسیم" ہے۔ استنبول کا ہلٹن ہوٹل اسی محلّہ میں ہے جو بیروت کے فینیسا اور سان جارج سے بھی بازی لے گیا ہے۔ جگہ جگہ نشاط گاہیں ہیں۔ استنبول کے ساحل قدرتی حسن کو دوبالا کرنے کا موجب بھی ہیں اور استنبول کی اخلاقی زندگی کی تباہی کا سب سے بڑا محرک بھی۔ باسفورس، مرمرا اور قرن ذہبی کے سواحل پر ۲۳ نہانے کے مرکز ہیں جو سال بھر رنگا رنگ تفریحی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں اور ۲۷ وہ "صنم کدے" ہیں جو ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی سبز پوش پہاڑیوں کی چوٹی پر قائم ہیں۔ دنیا بھر کے سیّاح یہاں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور سیاحت کے پردے میں عشرت و نشاط کی دل کھول کر داد دی جاتی ہے منظر

کے شہروں میں بیروت اور اسکندریہ کو اسی سیاحت نے تباہ کیا ہے۔ اس میں استنبول بھی پیچھے نہیں ہے۔ بیوغلو میں عورتوں کی گہما گہمی بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی نشاط گاہوں کی کثرت ہے۔ شہری عورتوں کی اکثریت کو منی اسکرٹ میں دیکھا۔ گو سردی بلا کی ہے مگر اسکرٹ اُس سے بھی بڑی بلا بن کر نازل ہو چکا ہے۔ اور اس کی خاطر عورت نے ہر تکلیف گوارا کر لی ہے۔ ستم یہ ہے کہ خود مردوں نے سر سے پاؤں تک گرم لباس پہن رکھا ہے۔ مگر عورت کو فیشن کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ امیر الشعراء شوقی بک نے کہا تھا: خدعوھا بقولھم حسناء (مردوں نے عورت کو خوبصورت کہہ کہہ کر اسے بیوقوف بنا رکھا ہے۔

یہودی اور دونمہ | بیوغلو کی ساز و سامان سے لبریز دکانوں، بلند و بالا عمارات، کشادہ شاہراہوں، اور ہوٹلوں اور پارکوں کی بہتات اور جگہ جگہ مصطفیٰ کمال کے مجسّموں کو دیکھ کر میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ فاتح کی نسبت بیوغلو میں یہ چکا چوند زیادہ کیوں ہے؟ نائف آفندی نے میرا یہ سوال اپنے دوسرے رفیقوں تک منتقل کیا۔ پروفیسر عُزیر نے بتایا کہ بیوغلو دراصل تجارتی مرکز بھی ہے اور اُونچے سرکاری ملازمین بھی زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ تجارت پر زیادہ تر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ بنک کاری کا تمام تر نظام اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بڑی بڑی تجارتی نمائش گاہیں جو نظر آ رہی ہیں ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ضرور کسی نہ کسی یہودی یا مرتد کا سرمایہ ہوگا۔ وہ دیکھیے جگمگاتا ہوا بورڈ "عثمانلی بنکاسی" (بنک آف عثمانیہ)۔ یہ یہاں کا سب سے مضبوط بنک ہے اور یہودی سرمایہ کاروں کا رہین منت۔ بیوغلو کی آبادی میں یہ دونوں گروہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہودی تو میری سمجھ میں آگئے۔ مگر یہ "مرتد" کیا ہوتے ہیں؟ پروفیسر عُزیر سے میں نے اس کی وضاحت چاہی۔ کہنے لگے جو لوگ لادینیت کے حامی ہیں، اور پس پردہ یہودیوں کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں ہم انہیں مرتد کہتے ہیں۔ نائف آفندی نے بات کاٹ کر اس نکتے پر اپنی طرف سے مزید روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ترکی میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو یہودی الاصل ہے۔ یہ گروہ اپنی مخصوص اغراض و مصالح کے تحت بظاہر مسلمان ہو گیا۔ اس گروہ کے افراد انجمن اتحاد و ترقی کے اندر بھی گھس گئے۔ فوج کے اندر بھی انہوں نے کلیدی آسامیوں پر قبضہ کر لیا۔ عثمانی خلافت کے آخری ایام میں باب عالی کے اندر بھی ان کو نفوذ حاصل تھا۔ "ولایاتِ ثلاثہ" ان کا اصل مرکز تھا۔ ولایاتِ ثلاثہ کا دوسرا نام مقدونیہ ہے اور اس میں تین صوبے شامل ہیں: سلانیک (SELONIK)، مناستر (MONOSTIR) اور قوصوہ (KOSOYD)

ترکوں کے اندر قومیت کے جراثیم پھیلانے میں اس گروہ کی کوشش کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ ترک اِس گروہ کو دُونما بھی کہتے ہیں۔ مگر اب دُونما کے بجائے مرتد کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔ نائف آفندی نے اس ضمن میں ترکی کے بعض چوٹی کے لیڈروں کا بھی نام لیا جو اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے یا اس کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہوگئے تھے۔ یہ بات پہلے کسی حد تک مخفی تھی مگر اب عام لوگ اس سے واقف ہوگئے ہیں۔ شام اور لبنان کے اندر جن ترک والیوں نے عربوں کے ساتھ تشدد برتا تھا ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا اور وہ عربوں کو ترکوں سے متنفر کرنے کے لیے یہ حربے اختیار کرتے تھے۔ مثلاً جمال پاشا جو شام کا آخری ترکی گورنر تھا اور اس نے دمشق کے چوراہے میں شامی لیڈروں کو پھانسیاں دی تھیں، یہ شخص دونمہ تھا۔ ترک مسلمان اس سے آج تک براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

مرتد کی یہ تشریح میرے لیے نیا انکشاف تو نہ تھی۔ البتہ اس پہلو سے یہ قابلِ لحاظ تھی کہ اب تک ہم نے باہر بیٹھ کر ترکی کی تاریخ حاضر کا جو مطالعہ کیا ہے اور اس سے جو جو اسباب و نتائج اخذ کیے ہیں وہ صحیح ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں دونما کی طرف جابجا اشارے کیے ہیں، بلکہ مرحوم نے اُسی زمانے میں اِس گروہ کی اصلیت کا پردہ چاک کر دیا تھا جب یہ عربوں اور ترکوں کے درمیان عداوت کے بیج بو رہا تھا۔ اسی طرح مراکش کے ماہنامہ دعوۃ الحق میں بھی چند سال قبل ایک تحقیقی مضمون دونما کی تاریخ پر شائع ہوا تھا۔ اِس مضمون کے لکھنے والے ترکی میں مراکش کے سابق سفیر عبدالقادر القادری ہیں۔ انہوں نے بھی دونما کے اسی کردار کو دلائل کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ اور خود ترک علماء اور اہلِ نظر کے حوالوں سے دونما کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ترکی کے ماضی کو بھی اسی گروہ نے داغدار کیا ہے اور حال کی تصویر بنانے میں بھی اس کا نمایاں کردار ہے۔ ترک مسلمان اب دونما سے اس قدر محتاط ہوگئے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سلانیک کا رہنے والا ہے تو سب کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔

شیخ یوسف جو قائدِ قافلہ تھے درمیان میں کہیں کہیں اپنی بات کر دیتے۔ مگر اُن کی گفتگو میں ٹیپ کا بند پاکستان اور ہندوستان ہوتے۔ بار بار وہ پاکستان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ راستے میں مجھے یہ بھی بتاتے رہتے کہ یہ فلاں عمارت اور یہ فلاں قلعہ ہے۔ مگر رات اپنی تمام رعنائیوں اور ضوپاشیوں کے باوجود کسی نووارد کو اُن بھیدوں سے آگاہ نہیں کرتی جن سے آگاہ کرنا دن کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ جامع سلطان احمد ہے۔ یہ جامع سلطان سلیم ہے۔ یہ نیلگوں مسجد ہے۔ یہ حصار رومیلی ہے۔ یہ یہاں کا مشہور قصر توپ کاپی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس وہ مجھے بہت کچھ بتاتے رہے اور بالآخر وہ موٹر کو ایک پہاڑی پر چڑھا کر لے گئے اور کہنے لگے اُتر کر استنبول کا منظر دیکھیں۔ (باقی)

مشرقی ممالک میں اشتراکیت

عبدالحمید صدیقی

مغربی ممالک میں جب صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا تو اس کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کیونکہ زود پیداواری اور کثیر پیداواری کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسی منڈیاں تلاش کی جائیں جہاں سے انہیں بھاری مقدار میں نہایت سستے داموں خام مال فراہم ہو سکے اور جہاں وہ اسی مال کی مصنوعات کو لوٹا کر بہت زیادہ قیمت وصول کر سکیں۔ اپنے اس مقصد کو اہلِ یورپ نے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے حل کیا۔ آغاز میں تو انھوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ مشرقی ممالک میں انہیں چند تجارتی سہولتیں حاصل ہو جائیں مگر ان کاروباری تعلقات میں جب ان پر مشرقی ممالک کی کمزوریاں آشکار ہوئیں اور انہیں اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں سیاسی غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، تو انہوں نے فوج کشی کر کے ان ممالک پر بالجبر تسلط قائم کر دیا۔ مگر اس تسلط میں بھی ان کے پیش نظر ہمیشہ یہی بات رہی کہ ان ممالک کو خام مال کی خرید اور مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہاں جو مدت حکمراں کی حیثیت سے گزاری اس میں اجنبی بن کر رہے اور عام آبادی کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اس بات کا البتہ انھوں نے ضرور التزام کیا کہ مشرقی اقوام کا اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے مذہب، اپنی روایات پر سے اعتماد متزلزل ہو اور ان کے اندر مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی افکار و نظریات کے لیے عقیدت کے جذبات پیدا ہوں ۔ وہ اپنی دنیا خود آباد نہ کر سکیں اور اگر کبھی مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد بھی ہوں تو ذہنی غلامی میں گرفتار رہنا پسند کریں۔

اہلِ مغرب نے سیاسی تفوق کے قیام کے ساتھ ہی اس امر کو بھانپ لیا تھا کہ مشرق کا بیدار ہونا یقینی ہے اور اس بیداری کے بعد اسے مدتِ دراز تک سیاسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا امر محال ہو گا۔ چنانچہ اس نے اس کے

باشندوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا۔ اسے ایک ایسا نظامِ تعلیم دیا جس سے انہیں اپنے معتقدات، اپنے افکار و نظریات پر اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ لیکن وہ انہیں مغربی تہذیب کا پوری طرح پرستار نہ بنا سکے۔ اہلِ مغرب کی ان مذموم کارروائیوں کا سب سے زیادہ نقصان مسلمان قوم کو پہنچا اور ان کے ظلم و ستم کا ہدف زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔

اسلام کے سوا مشرقی ممالک میں جتنی تہذیبیں اور جتنے فکری نظام تھے ان میں سے کوئی تہذیب اور فکری نظام ایسا نہ تھا جو مغربی افکار سے براہِ راست متصادم ہو۔ جس طرح اہلِ مغرب نے مذہب کو زندگی کا ایک گوشہ تصور کر کے حیاتِ اجتماعی کی عمارت خالص مادہ پرستی کی بنیاد پر اُستوار کر رکھی تھی بالکل اسی طرح مسلمانوں کے ماسوا مشرق کی دوسری قوموں نے مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ مذہب کو سیاست، معیشت اور معاشرت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور ان سارے معاملات کو دنیوی نظریات و قواعد کے مطابق طے کرنا چاہیے۔

یہ اندازِ فکر اور یہ طرزِ عمل مسلمانوں کے ضمیر سے مغایرت رکھتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی انگریز کے اس برِصغیر میں آنے سے پہلے ہی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی ورنہ اسے یہاں قدم جمانے اور مسلمان ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ دنیا پرستی نے اس قوم کے بڑے حصے کو خدا پرستی سے غافل کر دیا تھا۔ مگر اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اسلام سے اس عملی بے تعلقی کے باوجود اس حقیقت کے ہمیشہ معترف رہے کہ ان کی ذلت اور رسوائی کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں نے تو ترکِ مذہب کو فلاح کا ذریعہ سمجھا لیکن مسلمانوں نے اسے ہمیشہ اپنی تباہی و بربادی کا واحد سبب خیال کیا۔ یہ چُبھتا ہوا احساس ان کے اندر ہمیشہ موجود رہا کہ ان کی زندگی کا نقشہ اللہ اور اُس کے رسول کی دی ہوئی تعلیمات سے مختلف ہے اور یہی ان کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ دنیا میں اقبال مند ہونے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے آرزو مند ہیں تو انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر یہی احساس مختلف تحریکات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتا رہا۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان کی علمی کوششیں، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور

تحریک دیوبند، ندوہ اور اسی نوعیت کے دینی مدارس کا قیام، تحریکِ خلافت، تحریکِ پاکستان، سب اسی احساس کے مختلف مظاہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ مغربی تہذیب جس قوت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کرتی رہی اسی شدت کے ساتھ تصادم ہوتا رہا۔ سطح بین اہلِ مغرب اس آویزش کو مسلم قوم کی ہٹ دھرمی اور تعصب پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جتنی کتب بھی منظرِ عام پر آئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ قوم اپنی دشمن ہے اور اسے اپنی بھلائی اور بُرائی کی کوئی تمیز نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں اس امر کا صحیح طور پر جائزہ لیا گیا ہو کہ جب ساری قومیں مغربی تہذیب ہی میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہی ہیں تو آخر مسلمان قوم کیوں اس سے بار بار متصادم ہوتی اور اس کا راستہ روکتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسری اقوام کے تعلقات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یوں تو اہلِ مغرب کی اس ناسمجھی کے کئی اسباب ہیں مگر ان میں دو بڑے نمایاں ہیں:

(۱) صنعتی انقلاب کے بطن سے الحاد کی جو تحریک نمودار ہوئی (اور جسے جنم دینے میں اس وقت کے مذہبی حلقے کا بڑا دخل تھا) اُس کا واسطہ ایک ایسے مذہب سے پڑا جس نے صدیوں پیشتر ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے ضمیمے کی حیثیت سے زندہ رہنا گوارا کر لیا تھا اور اپنے اس موقف کو اپنا مقدر سمجھ رکھا تھا۔ اس وجہ سے الحاد کی تنگ نظر پادریوں اور ان کے خود ساختہ نظریات سے تو پنجہ آزمائی ضرور ہوئی مگر مذہب سے اس کا تصادم نہ ہُوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اس کشمکش کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ تاریخ کے اسی تجربے کو سامنے رکھ کر الحاد نے اسلام کے خلاف جنگ جیتنے کی کوشش کی اور یہاں بھی دینی رہنماؤں کو اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام اور کفر کی اس کشمکش میں صرف علماء ان کے مقابل بن کر آئیں گے مگر عام مسلم آبادی اس سے بے تعلق رہے گی اور وہ چند سو یا چند ہزار "ملاؤں" کو رُسوا اور بدنام کر کے یا ان پر مظالم ڈھا کر مغربی الحاد کو امتِ مُسلمہ پر مسلّط کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گذشتہ دو سو سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اہلِ مغرب نے اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ تعلقِ خاطر کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ یہ دین چند ملاؤں کی اجارہ داری نہیں جنہیں مٹا دینے سے اسے مٹایا جا سکتا ہو بلکہ یہ امت کی عظیم اکثریت کی عقیدت اور محبت کا مرکز ہے اور اس کے قلب و دماغ میں

یہ خیال پوری طرح راسخ ہے کہ اس کی بگڑی اگر کسی صورت میں بن سکتی ہے تو اسلام کو ہی سچے دل سے اپنا کر بن سکتی ہے اس ایک صورت کے سوا اس کی فلاح و بقا کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ امتِ مسلمہ کا اسلام پر اعتماد ابھی جوں کا توں قائم ہے۔ یہ فی الحقیقت اس کی بڑی بدنصیبی ہے کہ کسی مسلمان ملک میں بھی سنجیدگی اور اخلاص سے یہ کوشش نہیں کی گئی کہ اجتماعی معاملات کو طے کرنے کے لیے رشد و ہدایت کے اس واحد سرچشمے کی طرف دل و جان سے رجوع کیا جائے۔ اسلام کا نام تو بلاشبہ وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس مقدس نام پر لوگوں کو دھوکے بھی دیئے جاتے ہیں مگر اسے خلوص نیت کے ساتھ اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے دل میں اگر نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف ہیں جو اس مقدس نام سے ناجائز فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کی تقدیس ان کے دلوں میں پوری طرح موجود ہے اور وہ اُسے ایک خاص مذہبی طبقے کی میراث نہیں سمجھتے بلکہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر جب اس پر کوئی آنچ آتی نظر آتی ہے تو وہ اس المیہ کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ آگے بڑھ کر دشمن کی یلغار کو روکتے ہیں

(۲) اہلِ مغرب نے اس معاملے میں جس دوسری اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ الحاد اور مسیحیت کی پہلی جنگ سیاست، معیشت اور معاشرت کے میدانوں میں نہیں لڑی گئی بلکہ تخیلات اور مابعد الطبیعیات کے دُور دراز گوشوں میں لڑی گئی تھی۔ اہلِ مذہب نے مسیحیت کے نام پر کائنات کے بارے میں عجیب و غریب نظریات گھڑ رکھے تھے جن میں سائنسی انکشافات کے مقابلے میں آنے کی قوت نہ تھی مگر ہر شخص میں نہ تو اتنا علم تھا اور نہ شعور کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کر سکتا اور یہ دیکھ سکتا کہ علمی تحقیقات کے سامنے توہمات زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج اسلام اور الحاد کے درمیان جنگ ان میدانوں میں لڑی جا رہی ہے جن میں انسانوں کو کوئی فریب نہیں دیا جا سکتا۔ حقائق کا حقائق سے مقابلہ ہے، شواہد کی شواہد سے ٹکر ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل میدانِ عمل میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ میں اپنی اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

مغربی مفکرین اور سائنس دانوں اور مسیحی پادریوں کے مابین جو آویزش ہوئی اس کا محور زمین کی حرکت، چاند کی گردش، کائنات کا آغاز و انجام یا اسی نوعیت کے دوسرے طبیعیاتی مسائل تھے۔ اس آویزش نے بعض اوقات

تشدد کی صورت بھی اختیار کی جس کے نتیجے میں نہایت قیمتی جانیں بھی تلف ہوئیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسائل خواہ کتنی ہی بنیادی اہمیت کے حامل ہوں اور ان پر تحقیق نتائج کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی دُور رس ہو، مگر ایک عام آدمی کے لیے یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ بیچارا نہ تو اتنا علم رکھتا ہے اور نہ ایسے سائنسی آلات رکھتا ہے جو اُسے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دیں۔ اس کے نزدیک اِن کی حیثیت سنی سنائی باتوں کی سی ہے جس دلیل پر دل کو اطمینان ہو گیا اُسے قبول کر لیا اور جس سائنس دان کے علم پر بھروسہ کر لیا اس کی تصریحات کو صحیح مان لیا۔ ان مسائل کے بارے میں عام لوگوں کے نظریات یا میلانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مگر اسلام اور الحاد کی کشمکش بالکل واضح ہے۔ اس کے مختلف محاذوں کو بھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جس گولہ بارود سے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے اس کے عناصر ترکیبی کو بھی ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے، پھر جن مسائل میں تصادم ہو رہا ہے وہ بھی سب لوگوں پر پوری طرح آشکارا ہیں اور ہر فرد ان کی نوعیت کو اچھی طرح جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ مثلاً کون اس حقیقت سے آج ناواقف ہے کہ جس ملک میں سرمایہ داری آتی ہے وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے، وہاں ملکی دولت کا بیشتر حصہ ایک محدود طبقے کے اندر سمٹ کر رہ جاتا ہے، وہاں لوگوں کے اندر ہوس زر پیدا ہوتی ہے اور بے کسوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب اشتراکیت آتی ہے تو سنگین قسم کی آمریت کا تسلط قائم ہوتا ہے اور انسانوں کو بے جان آلات کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے منحوس سائے میں لطیف احساسات کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں اور اخلاق اور رُوحانیت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ انہیں جاننے کے لیے کسی گہرے علم، کسی وسیع تجربہ گاہ اور کسی بیش قیمت سائنسی سامان کی ضرورت نہیں ظاہر بات ہے کہ جو جنگ ان کھلے میدانوں میں لڑی جا رہی ہو اس کے بارے میں عام آبادی کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تلخ اور افسوسناک حقیقت آخر عوام کی نظروں سے کس طرح مستور رہ سکتی ہے کہ جن جن ممالک کی طرف سرمایہ داری اور اشتراکیت نے رُخ کیا وہاں دنیا پرستی کا دَور دورہ ہوا اور خدا سے بغاوت اور مذہب سے انحراف کی راہ ہموار ہوئی اور انسان نے مادّی دنیا اور اس کی لذات ہی کو اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب قرار دیا۔

ان حقائق کے کھل کر سامنے آجانے کے بعد اگر مسلم قوم کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار

دے دیا جائے تو وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ دونوں لعنتوں میں سے کسی لعنت کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی اہل مغرب نے ایک طویل تجربے کے بعد اس حقیقت کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے اس لیے انہوں نے اب مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ طریق کار اختیار کر رکھا ہے کہ سرمایہ داری نے مسلم ممالک میں جس افلاس کو جنم دیا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور عوامی جذبات کو مشتعل کر کے مسلم قوم کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اس کی غربت اور فاقہ مستی کا اگر کوئی کارگر علاج ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کی راہ اختیار کرے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کی آپس میں سر پھٹول بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر سرمایہ داری مسلم ممالک میں اشتراکیت کی کیونکر ہمنوائی کر سکتی ہے۔ مگر یہ حالات کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی اساس مادیت ہے۔ اس بنا پر اصل کے اعتبار سے وہ دونوں ایک ہیں۔ ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ محض طریق کار کا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں مادیت کی یلغار پیدائش دولت سے شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مذہب و اخلاق کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور ملک کے سارے وسائل کو براہ راست اپنی تحویل میں لینے کے بعد مذہب، اخلاق اور معاشرت پر حملہ آور ہوتی اور اس پر اپنا تسلط قائم کرتی ہے۔

اشتراکیت کی ٹیکنیک زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز ہے کیونکہ اقتدار پر بالجبر قبضہ کرنے کی وجہ سے کسی قوم کی پوری دولت، اس کے سارے وسائل اور ملک کی پوری انتظامی مشینری، الغرض اس کی پوری قوت اس کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے اور پھر کوئی ادارہ یا گروہ اس کی غیر معمولی طاقت کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ مسلمان قوم کو مغربی تہذیب میں رنگنے اور اسے معاشرتی، معاشی اور فکری اعتبار سے مغرب کا غلام بنانے کے لیے اشتراکی انقلاب زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک یہ حربہ کس قدر مؤثر ہے اس پر کئی ایک کتب شائع ہوتی ہیں۔ ہم ذیل میں ایک کتاب "تجدد کا چیلنج"[ل] کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ سرمایہ دارانہ ممالک مشرقی ممالک میں اشتراکیت کے فروغ کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے تسلط

ل THE CHALLENGE OF MODERNIZATION

BY I-R-SINAI

کے لیے آمریت کی کیوں تائید کرتے ہیں۔

"ظاہر بات ہے کہ جو انقلاب پسند طبقہ (معاشرے کی مغربی نظریات کے مطابق) تجدید کے لیے آگے بڑھے گا وہ اس کام کو آزاد جمہوری فضا کے اندر سر انجام نہ دے سکے گا۔ ان نظریات کے تسلط کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ معاشرتی اور معاشی قوت کا بیشتر حصہ حکومت کے قبضے میں ہو، تاکہ وہ رائے عامہ کے علی الرغم بہت سے ناپسندیدہ اقدام کر سکے اور لوگوں کی روایات اور ان کے دل پسند نظریات کو ہدفِ تنقید بنا سکے۔ معاشی ترقی کا خواب آزاد معیشت میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

جمہوریت ہر بیماری کا تریاق نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ہر ملک کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ انسانی ارتقاء میں بعض ایسی منازل بھی آتی ہیں جن میں مطلق العنانیت ایک ناگزیر ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ (اس قوم کے دل و دماغ کو صدیوں کی روایت کے ملبے سے صاف کیا جائے اور جاہل عوام پر ایسے تغیرات ٹھونسے جائیں جنہیں وہ خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ مشرقی قوموں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تبدیلی سے پہلے غیر معاشی حالات میں تغیر لایا جائے۔ اس بنا پر ان سارے ممالک کی اوّلین ضرورت یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی نئی قیادت کو ابھارا جائے جو ان سارے تغیرات کے بوجھ کو اٹھانے اور ان کے خطرات کو مول لینے کے لیے تیار ہو اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اس بات کا مصمم ارادہ رکھتی ہو کہ اسے اپنے معاشرے کی روایات کو قوت کے ساتھ توڑنا ہے اور عوام کو اس غیر معمولی ایثار کے لیے آمادہ کرنا ہے جو اہلِ مغرب کو مختلف تغیرات میں سے گذرتے ہوئے کرنا پڑا۔

یہ نئی قیادت اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑی سخت اور متشدد ہونی چاہیے اور اُسے اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ جمہوری طریقوں سے حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کی سیاسی بصیرت میں صرف دو عزائم ہی کارفرما ہونے چاہییں۔

(۱) معاشرے کو زیر و زبر کرنے کا عزم۔ (۲) اور معاشرے کو ایک آہنی نظم و ضبط میں جکڑنے کا ارادہ۔

اس نئی قیادت کو یہ بات پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ روایتی اداروں اور روایتی افکار کے اندر تبدیلی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ یک لخت ہی لائی جاتی ہے۔ کسی معاشرے کے مختلف شعبوں میں پیوندکاری یا اس کے کسی ایک گوشے یا دوسرے گوشے میں تبدیلی نئی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے اس بنا پر نئی اور بامقصد قیادت کو ایک وار میں زندگی کا پورا ڈھانچہ بدل دینا چاہیے تاکہ اس کا ماضی سے آناً فاناً رشتہ منقطع ہوجائے اور اس کے اندر نئی متوازن عادات اُبھر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ نئی قیادت ایک ایسی آمرانہ ریاست کی تشکیل کرے جو مروجہ نظام کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکے اور ایک ہی دھکے کے ساتھ لوگوں کو اپنی روایات کی دلدل سے نکال دے اور ان کے قدیم معتقدات اور مذہبی اعمال پر پوری شدت سے حملہ آور ہو۔ نیز اس قیادت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فرد کے حقوق کو نظرانداز کرے، معاشرے میں جن اداروں، گروہوں کو کسی قسم کے تحفظات حاصل ہیں انہیں ان سے محروم کرے اور کسی جماعت یا مفاد کو تجدد کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔

یہ نئی قیادت جس گروہ کو معرض وجود میں لائے گی وہ بڑا سخت جان، بڑا منظم اور تنظیمی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہوگا۔ اس میں بلاشبہ کچھ خامیاں بھی ہونگی مگر اس میں اتنی قوت اور خوداعتمادی ضرور ہوگی کہ وہ تجدید کی راہ کی ان ساری رکاوٹوں کو دُور کرسکے جنہیں بعض معاشرتی روایات نے جنم دیا ہے۔

اس نئی قیادت کو سب سے پہلے سست رفتار معاشرتی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے اور مغرب میں نشاۃ ثانیہ اور تحریک احیاء العلوم نے جس روح کو جنم دیا ہے اُسے اچھی طرح اپنا کر آگے بڑھنا ہے۔ مغربی اقدار، مغربی احساسات، مغربی محاسن اور مغربی نقطۂ نظر سے فائدانہ صلاحیت کو اپنائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ اور جب تک مشرقی معاشرے اپنے آپ کو مغرب کی ساری صفات سے اچھی طرح متصف نہیں کرلیتے، ان میں جدید مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک ایسا نیا نصب العین درکار ہے جو نہ صرف

معاشرتی اقدار کے قدیم پیمانوں کو پوری قوت کے ساتھ تبدیل کر دے بلکہ نئے نظامِ اخلاق کی بھی صورت گری کرے۔

یہ نصب العین ایک ایسا تیزاب ہو جس میں مروجہ معاشرتی روابط خود بخود تحلیل ہو کر رہ جائیں۔ اس انقلاب انگیز نصب العین کی کئی شکلیں اور صورتیں ممکن ہیں مگر اس کا مقصد بہر طور یہ ہونا چاہیے کہ وہ مذہب اور اس کی روایات کی بے ہنگم قوتوں کو پامال کرے اور توڑے اور ایک ایسا نیا مضبوط انسان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اپنے آپ کو پوری طرح تبدیل کرے اور معاشرے کو بھی مکمل طور پر بدل ڈالے۔ جب تک اس نئے نصب العین میں لوگوں کی زندگیوں میں بالجبر انقلاب لانے اور پرانی روایات کو توڑنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی روایات جنہوں نے ذہنوں کو زنگ آلود کر کے عوام کی صلاحیتوں کو بیکار بنا دیا ہے۔ اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں حریت اور آزادی کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

مسٹر سیلئے نے اپنی کتاب میں مشرق کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے جو نسخہ پیش کیا ہے اس کے اجزاء کا بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بربادی کا یہ مرکب تیار کیا گیا ہے اور اگر مشرق کی کوئی ہوشمند قوم اس کی ہولناکیوں کا احساس کرتے ہوئے اس زہر کو پینے سے انکار کر دے۔ تو اسے زبردستی پلانے کے لیے کس تشدد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ سارا پروگرام اس مفروضے پر طے کیا گیا ہے کہ مشرق کی ساری اقوام فکر و نظر کے اعتبار سے تہی دامن ہیں۔ وہ اپنے پاس کوئی ایسا انقلابی نصب العین اور ضابطہ نہیں رکھتیں جن کے بل پر وہ دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ انہیں اگر دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کو پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں۔ مگر یہ ہمہ گیر انقلاب کسی مشرقی قوم کو آزادی کی فضا مہیا کر کے جمہوری طریق سے برپا نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان اقوام کا مذہب اور اس کی روایات اس انقلاب کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور مشرقی قوموں کو بالجبر مغربی تمدن میں رنگنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں کسی ایسے انقلاب انگیز نصب العین کو اپنانے پر مجبور کر دیا جائے جس سے ان کے فکر و نگاہ کے زاویے اور جذبہ و احساس کے ڈھانچے دفعتاً تبدیل ہو جائیں۔

اور وہ خود اپنی مذہبی روایات توڑ کر اور اخلاقی ضابطوں سے بغاوت کر کے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تمدن کی علمبردار بن جائیں۔

کسی قوم کو اس کی روایات سے بیگانہ بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جس کے لیے وہ خوشدلی سے تیار ہو جائے۔ اس بنا پر مسٹر سینائے نے کھل کر یہ کہا ہے کہ یہ کام آمریت، تشدد کی مدد سے ہی بخوبی سرانجام دے سکتی ہے۔ چنانچہ اس نئی قیادت کی کامیاب جدوجہد کے لیے تین چیزیں از بس ضروری خیال کی ہیں۔

(۱) ایک ایسا خیال انگیز نصب العین اور معاشرت، سیاست اور معیشت کا ایسا ہمہ گیر نظام جو سیلاب بن کر اُمڈ پڑے اور مذہب اور مذہبی روایات کو پوری قوت کے ساتھ اپنے ساتھ بہا لے جائے اور مغربی تہذیب کی نشوونما کے لیے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ زمین ہموار کر دے۔

(۲) اس نئی قیادت کا مزاج سراسر آمرانہ ہو اور وہ قوم پر نہایت سخت قسم کی آمریت مسلط کرے اور اپنے انقلاب انگیز عزائم کی تکمیل میں رائے عامہ کو قطعاً درخورِ اعتناء نہ سمجھے بلکہ اگر کسی گوشے سے بھی اختلاف کی معمولی آواز بھی بلند ہو تو اُسے سختی سے دبا دے۔

(۳) یہ قیادت انقلاب کے لیے تشدد پر کامل ایمان رکھتی ہو اور قوم سے ہر بات جبر کے ساتھ منوانے کے لیے تیار ہو۔ جو لوگ اس کے انقلابی پروگرام کا ساتھ دینے میں ذرا سُست رفتاری کا ثبوت دیں انہیں بلاتامل نیست و نابود کر دے۔

مسٹر سینائے کے تجزیہ کے مطابق یہ کام صرف اشتراکیت کے ہاتھوں ہی بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے اور صرف کامریڈوں کے جتھے انقلابی قیادت کی ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنف کے قول کے مطابق اشتراکیت ایک ایسا انقلاب انگیز نصب العین ہے جو طوفان بن کر اُٹھتا ہے اور مذہب اور اس کی روایات کو چشم زدن میں تاراج کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسرے اشتراکیت آمریت کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی مُنہ زور ہوتی ہے اور اس کی بے حس جکڑ بندیاں اشتراکیت کے علمبرداروں کو دین اور اخلاق برباد کرنے کی کھلی چھٹی مہیا کرتی ہیں اور انہیں اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی راہ میں مزاحم ہوں اذیت ناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اتار دے۔ مادیت، آمریت اور تشدد

یہ وہ تثلیث ہے جس پر ہر اشتراکی پورا پورا ایمان رکھتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کا انکار اشتراکی شریعت میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔

اس ضمن میں سینائے صاحب کا استدلال ملاحظہ فرمائیں:

"عہدِ جدید میں اشتمالیت بیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ انقلاب کا نہایت اچھا نعم البدل ہے جو بدقسمتی سے روایت پرست معاشروں میں کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جاسکا۔ یہ نظام بلاشبہ متشددانہ اور کلیت پسندانہ ہے مگر پس ماندہ معاشروں کو صنعتی اور جدید بنانے اور معاشی، تعلیمی اور سائنسی میدانوں میں انہیں مغرب زدہ بنانے کے لیے یہ نہایت ہی کارگر ہتھیار ہے اور پھر چونکہ اس میں کسی معاشرت کی گہری روایات کے انکار کا بھی حوصلہ ہوتا ہے اس لیے کسی نئے صنعتی معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اس سے بے پناہ قوت مہیا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ نظام اپنی وحشیانہ طاقت کے بل بوتے پر پوری قوم کو کام پر لگا سکتا اور معاشرے کو زیر و زبر کر سکتا ہے اور وحشیانہ بے حسی کے ساتھ ہر جماعت اور طبقے کے دعوے کو نظر انداز کر سکتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو۔ پھر اس نظام کو برپا کرنے میں لوگوں پر جو مصائب آئیں یا وہ جن شدائد سے دوچار ہوں سوشلزم ان کے بارے میں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔

"اشتمالیت نے خود آگے بڑھ کر ایک ایسی "مملکتی سرمایہ داری" یا نوکرشاہی کو جنم دیا ہے جو کسی صنعتی معیشت کا نقشہ تیار کرنے، اسے کامیابی کے ساتھ چلانے اور اس کا بہتر طور پر انتظام و انصرام کرنے کے لیے انسانوں کے اندر مغربی صفات اور خوبیاں پیدا کرتی ہے۔" مملکتی سرمایہ داری کی تشکیل اشتمالیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔"

مسلمانوں، بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سینائے صاحب کی ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں اصل کے اعتبار سے کچھ بھی فرق ہے اور کیا اشتراکیت کا مقصد مغرب کی اسی مادی تہذیب کو فروغ دینا نہیں ہے جسے سرمایہ داری اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھی ہے؟ ان کے مابین اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ جس نحوست کو سرمایہ داری آہستہ آہستہ لاتی ہے اسے اشتراکیت یکبار قوت کے

انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

اسلامی قانون میں

ڈاکٹر عبد العزیز عامر

ترجمہ: معروف شاہ شیرازی

(۸)

دیت میں اضافہ ان حالات کی مثال، جن میں مقررہ دیت سے زیادہ تاوان عائد کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ ضربات کے نتیجے میں، مثلاً شخصِ متضرر کے تمام دانت گر جائیں۔ اور کسی وجہ سے قصاص اس قضیے میں ساقط ہو جائے۔ یا صورت یہ ہو کہ دانت ایک ایسے جرم کے نتیجے میں گر گئے ہوں، جس کا ارتکاب بطور خطا کیا گیا ہو۔ اس صورت میں پوری دیت کے علاوہ دیت کا ۳/۵ حصہ مزید عائد ہوگا[1] کیونکہ ہر شخص کے بالعموم ۳۲ دانت ہوتے ہیں۔ اگر ہر دانت کی دیت ۱/۲۰ ہو تو ۳۲ دانتوں کا تاوان ۳/۵ ۱ بنتا ہے۔ اس مثال میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ جرم کے نتیجے میں خواہ عضو ضائع ہو یا فقط اس کی ادا دیت زائل ہو دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہوگا[2]۔

دیت غیر معینہ اگر کسی قضیے میں قصاص، دیت اور کوئی مقررہ تاوان (PRESCRIBED DAMAGES) نہ ہو تو

---

[1] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۳۱۵۔ اور اس میں ہے: "مجرم نے کسی شخص کو مارا اور اس کے تمام دانت گر گئے اس میں پوری دیت اور ۳/۵ حصہ مزید واجب ہوگا۔ کیونکہ دانت ۳۲ ہوتے ہیں" ص ۳۲۲۔

[2] الکاسانی، ج ۷، ص ۳۱۴۔

۴۔ زور سے آناً فاناً مسلط کر دیتی ہے۔ سرمایہ داری جس مفسدانہ و مہلکانہ عمل کا آغاز کرتی ہے، اشتراکیت اُسے نہایت سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

اس میں غیر مقرر تاوان (UNPRESCRIBED DAMAGES) واجب ہوگا تاکہ جرم کے نتیجے میں ہونے والا نقصان بغیر کسی تلافی کے نہ رہ جائے اور ہر قسم کی سزا سے بچ کر مجرم ارتکاب جرائم پر جری نہ ہو[1]۔ غیر مقررہ تاوان کو منصفانہ معاوضہ (PROPER DAMAGES) یا منصفانہ فیصلہ (JUDICIAL DECISION) کہا جاتا ہے۔ اور یہ فیصلہ ایک جج وہاں کرتا ہے، جہاں شارع کی طرف سے قانون میں کوئی مقررہ سزا یا تاوان تجویز نہ کیا گیا ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جج کس معیار کے مطابق غیر مقرر تاوان کے تعین کا فیصلہ کرے گا؟ امام طحاوی کہتے ہیں کہ وہ فرد متضرر کو ایک صحیح وسالم اور بھلا چنگا غلام تصور کر کے اس کی دیت مقرر کرے گا پھر وہ موجودہ ضرر رسیدہ حالت میں اسے غلام تصور کر کے اس کا خونبہا مقرر کرے گا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے؟ یہ فرق کم تر درجے کی دیت کا ایک جزء ہوگا۔ فقہی اصطلاح میں اسی کو "الحکومۃ" یا "حکم العدل" (منصفانہ عدالتی تاوان) کہا جاتا ہے۔

لیکن امام کرخی کہتے ہیں کہ جن جرائم میں مقرر تاوان نہیں ہے، انہیں اس قریبی جرم پر قیاس کیا جائے گا جس میں دیت مقرر ہے۔ دو ماہر سرجن اس امر کا تعین کریں گے کہ ان زخموں اور جانی نقصانات کی مقدار کیا ہے جن کا تاوان معروف کی کثرت یا قلت دونوں صورتوں میں غیر مقرر ہے۔ جج ان ماہرین جراحت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرے گا اور متضرر کو مقرر تاوان کا ایک حصہ دلائے گا۔ امام کرخی کہتے ہیں کہ پہلی رائے پر اگر عمل کریں تو اس سے بعض اوقات لازم آتا ہے کہ کھوپڑی اور سر کے ایک چھوٹے زخم کا معاوضہ تو بہت زیادہ ہو جائے اور اس کے مقابلے میں ایک بڑے زخم کا معاوضہ کم ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک غلام کا زخم گوشت اور ہڈی کے درمیان والے پردے (سمحاق) تک پہنچ جائے تو اس کا تاوان پوری دیت کے ½ سے زاید ہوگا۔ اگر ایک آزاد آدمی کی دیت کو لے کر اس اصول کے وجوب کو تسلیم کیا جائے تو اس طرح سمحاق کے زخم کا تاوان اس زخم سے زیادہ ہو جائے گا جو گوشت اور سمحاق سے بھی آگے گزر کر ہڈی کو بالکل ننگا کر دے حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔

[1] البدائع۔ الکاسانی، ج ۷، ص ۳۲۳ لکھتے ہیں: "قاعدہ یہ ہے کہ قتل سے کم درجے کے جن جرائم میں قصاص یا مقررہ معاوضہ نہیں ہوتا، تو اس میں منصفانہ فیصلہ (ارش بالحکومۃ) ہوگا کیونکہ ایک بے قصور متضرر کے متعلق قاعدہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے اور مجرم کی سرزنش کی جائے۔"

مقدم الذکر رائے کے حق میں سند یہ ہے کہ آزاد کی دیت کے بالمقابل غلام کی دیت ہے۔[۱]

وہ حالات جن میں منصفانہ معاوضہ (PROPER DAMAGES) یا غیر مقررہ تاوان (UNRESCRIBED DAMAGES) واجب ہوتا ہے۔ ان کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے کسی عضو کو جوڑ کے نصف حصّے سے کاٹ دے۔ جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق ایسے حالات میں قصاص ممکن نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی مقررہ تاوان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا غیر مقررہ تاوان واجب ہوگا۔[۲]

اسی طرح ان تمام حالات میں بھی قصاص نہیں ہوتا، اور مقرر کے بجائے غیر مقرر تاوان ہوتا ہے۔ جن میں جسم کی کوئی ہڈی مضرت کا نشانہ بنے۔ چند حضرات کو چھوڑ کر جمہور علماء کی یہی رائے ہے کیونکہ اس صورت میں مضرت کے مماثل اور برابر قصاص لینا ممکن نہیں ہے۔ جہاں کوئی مقررہ معاوضہ نہیں ہے، ایسے تمام حالات میں غیر معیّن تاوان واجب ہوتا ہے۔[۳]

جسم کے زائد اعضاء میں بھی غیر مقررہ معاوضہ واجب ہے۔ مثلاً زائد انگلی۔ اس میں قصاص واجب نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی مقررہ دیت ہے۔ کیونکہ زائد انگلی کی نہ کوئی افادیت ہے اور نہ اس سے جسم انسانی کی خوبصورتی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے لیکن وہ نفس انسانی کا ایک حصّہ ہے اور انسانی نفس کی حفاظت

---

[۱] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۳۲۴ - ۳۲۵۔ تبیین الحقائق شرح الکنز زیلعی، جزء ۶، ص ۱۳۳۔ الشرح الکبیر، جزء ۹، ص ۶۳۷ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۲۶۲، لکھتے ہیں: "غیر مقررہ معاوضہ یہ ہے کہ حاکم متضرر کی قیمت یہ فرض کرتے ہوئے مقرر کرے گویا کہ وہ بے عیب غلام ہے۔ پھر عیب اور مضرت کی موجودگی میں اس کی قیمت کا اندازہ کیا جائے۔ اس طرح دو قیمتوں کے درمیان جو فرق ہوگا وہ عدالتی تاوان ہوگا"۔ التاج والاکلیل لمختصر خلیل ج ۶ ص ۲۵۸۔ یہ کتاب مواہب الجلیل کے حاشیے پر چھپی ہوئی ہے۔ حاشیہ الدسوقی علی شرح الدردیر، جزء ۴ ص ۳۱۵، ۳۱۶۔

[۲] الکاسانی، ج ۷، ص ۳۰۲۔ لکھتے ہیں: "اس نے نصف حصّہ کاٹ لیا تو اس میں قصاص نہیں ہے۔ کیونکہ نصف بند سے کٹنے کی صورت میں پورا پورا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے۔ اس میں منصفانہ معاوضہ واجب ہوتا ہے کیونکہ اس پر کوئی مقررہ تاوان نہیں ہے"۔ [۳] الکاسانی ج ۷، ص ۳۲۳: "ہر عام قسم کی ہڈیوں کے ٹوٹ جانے میں غیر مقررہ عدالتی تاوان واجب ہوتا ہے۔ صرف دانت اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ ہڈی میں برابر کا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے نیز شریعت نے اس میں کوئی تاوان مقرر نہیں کیا"۔

اور احترام واجب ہے، اگرچہ اس کی کوئی افادیت اور زینت نہ ہو۔ علاوہ ازیں زائد اعضاء کے نقصان سے بھی ضرر رسیدہ انسان بدنمائی اور رنج والم میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے جسد انسانی کے اجزاء اگر تلف ہوں، تو ان پر ضمان بہرحال لازم ہے[1]۔

اسی طرح ان اعضاء میں بھی غیر مقررہ تاوان واجب ہوتا ہے جو اپنے تخلیقی مقاصد نہ پورے کر رہے ہوں۔ مثلاً گونگے کی زبان[2]، ایسی آنکھ جس میں بینائی نہ ہو[3]، شل ہاتھ اور پاؤں[4] اور خصی اور عنین کے اعضائے جنسی[5]۔ ان اعضاء میں قصاص اس لیے نہیں ہے کہ دونوں میں برابری مفقود ہے۔ اور ان میں شارع کی جانب سے کوئی مقررہ تاوان بھی نہیں ہے۔ چونکہ یہ اعضاء جسم انسانی کا ایک حصہ ہیں۔ اور جسم کے تمام اعضاء شریعت کی نظر میں محترم اور مضمون (GUARANTEED) ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی حسن اور منفعت نہ رکھتے ہوں۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مضرت کی وجہ سے متضرر درد والم کا شکار ہوتا ہے اور اس کی خوبصورتی اور زیب وزینت میں بھی فرق آتا ہے۔

---

[1] الکاسانی جزء ۷، ص ۳۲۳۔ تبیین الحقائق، شرح الکنز زیلعی ج ۶، ص ۱۳۴۔ السرخسی جزء ۲۶ ص ۱۶۶، ۱۶۴۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلی، ص ۲۶۲۔

[2] البدائع، الکاسانی، ج ۷، ص ۳۲۳ "گونگے کی زبان میں منصفانہ معاوضہ ہے"۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلی ص ۲۶۲۔

[3] البدائع، الکاسانی، جزء ۷، ص ۳۲۳۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلی ص ۲۶۲۔

[4] البدائع، الکاسانی، جزء ۷، ص ۳۲۳۔ "اور اس میں لکھتے ہیں "شل ہاتھ اور پاؤں میں منصفانہ معاوضہ ہے"۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلی ص ۲۶۲۔

[5] البدائع، الکاسانی، جزء ۷، ص ۳۲۳۔ لکھتے ہیں: "خصی اور عنین کے آلۂ تناسل میں بھی منصفانہ معاوضہ ہے... چونکہ ان میں منفعت نہیں ہے لہٰذا محض ظاہری شکل کا کوئی اعتبار نہ ہوگا"۔

— مبحث ثانی —

سر اور چہرے کے زخموں کی اقسام اور ان کے احکام

شجاج | شجاج شجّۃ کی جمع ہے اور شجّۃ سر اور چہرے پر آنے والے زخموں کو کہتے ہیں۔ اس کی تعریف میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ شجّۃ صرف وہ زخم ہے جو سر اور چہرے یا ان مقامات پر آئے جہاں سر اور چہرے کی ہڈی ہوتی ہے۔ مثلاً ماتھا، رخساروں کا وہ بالائی حصہ جس میں ہڈی (MALAR BONE) ہو، یا کنپٹی، ٹھوڑی اور جبڑے کا وہ حصہ جو رخساروں سے نیچے ہو۔ ان کے نزدیک شجّۃ الآمّہ سر اور چہرے کا صرف وہ زخم ہے جو دماغ کی جلد (MENINGES) تک پہنچ جائے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور بعض دوسرے فقہاء یہ کہتے ہیں کہ سر اور چہرے کے علاوہ جسم کے جس حصے میں ایسے زخم ہوں، جن پر شجاج کے ضمن میں بحث ہو رہی ہے تو وہ بھی شجّۃ ہی کہلائیں گے۔ لیکن جمہور فقہاء کی رائے یہی ہے کہ شجّۃ کا اطلاق صرف اس زخم پر ہو گا جو سر اور چہرے پر آئے اور اس کے ماسوا دوسرے زخموں کے لیے لفظ جراحۃ (WOUND) استعمال ہو گا۔[1]

---

[1] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۶، لکھتے ہیں: "شجّۃ وہ زخم ہے جو سر اور چہرے کے ان مقامات پر آئے جہاں ہڈی ہو، مثلاً پیشانی رُخسار، کن پٹی، رخساروں سے نیچے ٹھوڑی اور جبڑے۔ آمّہ وہ زخم ہوتا ہے جو سر اور چہرے کی ایسی جگہ پر آئے جہاں سے وہ دماغ تک پہنچ جاتے ..... عام فقہاء کا یہی قول ہے ..... لیکن بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ان زخموں کے احکام جسم کے دوسرے حصّوں میں بھی جاری ہوں گے۔" —— تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶، ص ۱۳۲، اس میں لکھتے ہیں: "شجاج خاص طور پر سر اور چہرے کے زخموں کو کہتے ہیں..... اس کے سوا بدن کے دوسرے زخموں کے لیے جراح (WOUND) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔" —— الشرح الکبیر، ج ۹، ص ۶۱۹، لکھتے ہیں: "شجّۃ مخصوص طور پر سر اور چہرے کے زخموں کے لیے استعمال ہوتا ہے —— نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۷، ص ۲۹۔ اس بنا پر سر اور چہرے کے زخموں کو شجّۃ کہتے ہیں، اگرچہ یہ بھی جسم انسانی کے دوسرے زخموں کی طرح ایک زخم ہوتا ہے۔ لیکن عرب سر اور چہرے کے زخموں کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اس کے اقسام امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شَجَّۃ کی گیارہ قسمیں ہیں:

حارصہ، دامغہ، دامیہ، باضعہ، متلاحمہ، سمحاق، مُوضحۃ، ہاشمہ، منقلہ، آمہ اور دامغہ۔

امام محمدؒ نے شجاج کی ۹ قسمیں ذکر کی ہیں انہوں نے حارصہ اور دامغہ کا ذکر نہیں کیا۔[۱]

امام مالکؒ کے نزدیک اس کی صرف دسؔ اقسام ہیں۔ ان میں انہوں نے ہاشمہ کو حذف کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہاشمہ کا اطلاق ان زخموں پر ہوتا ہے جو سر اور چہرے کو چھوڑ کر جسم کے دوسرے حصوں میں آئیں۔ امام مالکؒ شَجَّۃ کی تقسیم دامیہ سے شروع کرتے ہیں اس کے بعد حارصہ پھر سمحاق، پھر باضعہ، پھر متلاحمہ اور چھٹا ان کے نزدیک "ملطاۃ" سے موسوم ہے۔[۲]

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بھی شَجَّۃ کی دس اقسام ہیں، کیونکہ یہ دونوں حضرات دامغہ کو حذف کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ امام احمدؒ دامیہ کو بازلہ بھی کہتے ہیں جب کہ دونوں ائمہ آمہ کو مامومہ بھی کہتے ہیں۔[۳]

ان کے معانی آئندہ سطور میں ہم شَجَّۃ کے معانی کی تفصیل بیان کریں گے:

۱۔ حَارِصَہ (SCRATCH) یعنی خراش۔ یہ وہ زخم ہے جو جلد پر آئے لیکن اس سے خون نہ بہے۔ عرب کہتے ہیں حرص القصار الثوب (دھوبی نے کپڑا پھاڑ دیا، یعنی کوٹتے ہوئے اسے پھاڑ دیا۔

---

[۱] الکاسانی، ج ۷، ص ۲۹۶، لکھتے ہیں "شَجَّۃ کی تعداد گیارہ ہے، حارصہ. . . . . دامغہ۔ امام محمدؒ نے تعداد ۹ لکھی ہے۔ انہوں نے حارصہ اور دامغہ کا ذکر نہیں کیا" تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۲ لکھتے ہیں: "شجاج . . . آمہ" "آمہ کے بعد ایک زخم کا ذکر ہوا کرتا ہے، جسے دامغہ کہتے ہیں، لیکن امام محمدؒ نے اس کا ذکر نہیں کیا"

[۲] التاج والاکلیل لمختصر خلیل، یہ مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل کے حاشیہ پر مطبوع ہے۔ ج ۶ ص ۲۴۶ - ۲۴۷۔ حاشیۃ الدسوقی علی شرح الدردیر، ج ۴، ص ۲۹۳ اور اس کے بعد۔ الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۱۹۔

[۳] المہذب، ج ۲ ص ۲۱۲۔ نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج۔ ج ۷، ص ۲۹ اور اس کے بعد۔ کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۳ ص ۳۸۵ اور اس کے بعد۔ الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۶۱۹۔ یہ المغنی کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ، ص ۲۶۱ اور اس کے بعد۔

۲- دامعہ (TEARER) وہ زخم ہے جو آنسوؤں کی طرح خون کو ظاہر کر دے مگر خون اپنی جگہ سے بہے نہیں۔

۳- دامیہ (BLEEDING) وہ زخم جس سے خون بہہ نکلے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ دامیہ وہ ہے جس میں خون تو آجائے لیکن بہے نہیں۔ اگر تعریف یہ ہو تو پھر دامعہ وہ زخم ہوگا جس سے خون بہہ نکلے۔

۴- باضعہ: (DISSECTION) وہ زخم جو جلد کو کاٹ دے، بَضَعَ عربی زبان میں کاٹنے اور پھاڑنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۵- متلاحمہ یہ وہ زخم ہے جس سے گوشت کٹ جائے، لیکن اس کے بعد گوشت مل جائے اور کٹی ہوئی جگہ باہم جڑ جائے۔ امام محمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ متلاحمہ کا نمبر باضعہ سے پہلے ہے۔ متلاحمہ التحم الشیئان سے ماخوذ ہے یعنی دو چیزوں کا باہم جڑ جانا، جبکہ ان میں سے ہر ایک دوسری سے جڑ جائے۔ لہٰذا متلاحمہ وہ ہوگا جو جلد کے نیچے گوشت کو ظاہر تو کر دے لیکن کاٹے نہیں اور باضعہ کا نمبر اس کے بعد آئے گا کیونکہ اس میں گوشت بھی کٹ جاتا ہے لیکن ظاہر روایت میں اس کی تعریف یہی منقول ہے کہ متلاحمہ وہ ہے جو گوشت کے بیشتر حصے کو کاٹ دے اور اس کا نمبر باضعہ کے بعد آتا ہے۔

۶- سِمحاق، وہ زخم جو اس باریک جھلی (PERIOSTEUM) تک پہنچ جائے جو گوشت اور ہڈی کے درمیان ہوتی ہے۔ اس زخم میں جلد کے بعد تمام گوشت بھی کٹ جاتا ہے اور ہڈی پر صرف باریک جھلی رہ جاتی ہے۔

۷- مُوضِحہ: (REACHES TO BONE) وہ زخم جو ہڈی کو ظاہر کر دے۔ اس میں جلد، گوشت اور سمحاق تینوں کٹ جاتے ہیں۔

۸- ہاشِمہ، یہ وہ زخم ہوتا ہے جس میں ہڈی ٹوٹ تو جاتی ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔

۹- مُنَقِّلہ، وہ جو ہڈی کو توڑنے کے بعد اسے اپنی جگہ سے بھی ہٹا دے۔

۱۰- آمّہ، وہ زخم جو اُمّ دماغ تک پہنچ جائے۔ امّ دماغ وہ باریک جھلی ہے جو دماغ کو مجتمع رکھتی ہے۔

۱۱- دامغہ، وہ زخم جو دماغ تک پہنچ جائے، امام محمدؒ نے اس زخم کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ دماغ تک چوٹ کے نفوذ کر جانے کے بعد بالعموم منضرب چل بستا ہے، لہٰذا یہ زخم شجہ نہیں رہتا بلکہ قتل شمار ہوتا ہے۔[۵]

ھ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں

رسائل و مسائل

آیت "قُلِ العَفوْ" کی تشریح

(غلام علی)

سوال۔ سوشلزم کے حامی بعض اوقات اپنی تائید میں قرآنی آیات اور علامہ اقبال کا کلام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سلسلے میں قرآن مجید کے ارشاد قُلِ العَفوْ کا حوالہ دیا جا رہا ہے اور اس سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر شخص کی زاید از ضرورت املاک اُس سے لے کر قومی ملکیت میں دے دے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے انفرادی ملکیت کی نفی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے دو شعر بھی نقل کیے جاتے ہیں، جو درجِ ذیل ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

علامہ اقبالؒ کے ایک دوسرے شعر سے عجیب و غریب استدلال بھی سامنے آیا ہے۔ تشدد و تخریب اور غارت گری و آتش زنی کا پرچار کرنے والوں کو جب ٹوکا گیا تو انہوں نے اقبال کا یہ شعر پڑھ دیا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) شجہ اور اس کے مفہوم پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: تبیین الحقائق، شرح الکنز، زیلعی ج ۶ ص ۱۳۲ — نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۷ ص ۲۹، ۳۰ — الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۲۶۱، ۲۶۲ — الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۶۱۹ — التاج والاکلیل لمختصر خلیل، ج ۶ ص ۲۴۶، ۲۴۷، یہ کتاب مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل کے حاشیہ پر مطبوع ہے — حاشیہ الدسوقی علی شرح الدردیر، ج ۴ ص ۲۹۳ اور اس کے بعد۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

حیرانی ہوتی ہے کہ اس طرزِ استدلال کا کیا جواب دیا جاتے ؟ کیا علامہ مرحوم کا منشا یہ ہو سکتا تھا کہ فصل بھرے کھیتوں کو آگ لگا دی جاتے ؟

جواب : قرآن مجید کے ارشاد "قُلِ الْعَفْوَ" اور بعض دوسری قرآنی آیات کو جس طرح غلط طور پر کمیونزم اور سوشلزم کی تائید میں آج کل استعمال کیا جا رہا ہے ، اس کی پُوری حقیقت واضح کرنے کے لیے مفصل بحث درکار ہے' "تاہم مختصر طور پر آپ کے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے :

اسلامی نظام اور اشتراکی نظام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام سب سے پہلے انسان کی باطنی و اخلاقی اصلاح پر توجہ دیتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف اور محاسبۂ آخرت کا احساس پیدا کرتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر میدان میں ، خواہ وہ معاشی ہو یا سیاسی یا معاشرتی ، نیکی اور شرافت کا رویّہ اختیار کرے - اگر ہم غور کریں تو یہ حقیقت ہم پر بآسانی واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کا ہر مسئلہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی مسئلہ ہے اور انسان کے اخلاق کو درست کیے بغیر اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی اور نہ دنیا سے شر و فساد کو مٹا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاقی اصلاح اور اس کی وساطت سے جملہ شعبہ ہائے حیات کی اصلاح کے ضمن میں اسلام قانونی اور سیاسی تدابیر کو بھی کام میں لاتا ہے لیکن اسلام اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ ساری خرابیوں اور مشکلات کا حل بس یہ ہے کہ ڈنڈے کے زور سے لوگوں کی املاک کو اندھا دھند سلب کر لیا جائے اور قومی ملکیت کے پُرفریب نام پر انہیں چند ایسے جبّار اور شریر جبّار افراد کے قبضے میں دے دیا جائے جو خدا و خلق کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوں۔

اس کے برعکس سوشلزم جس نظریۂ حیات کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ایک معاشی حیوان بلکہ درپردہ ایک شیطان ہے جس میں اخلاقی حس موجود ہونے ، اسے بیدار کرنے اور معاشی انصاف پر آمادہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی میں ہر خرابی کی جڑ بس انفرادی ملکیت ہے اور اس کا ازالہ صرف اس طرح ہوگا کہ انفرادی حقِ ملکیت کو قانوناً سلب کر لیا جائے اور ذرائع پیداوار کو حکمرانوں کی تحویل میں دے دیا جائے - لیکن اس کے بعد بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا کوئی معقول جواب سوشلسٹوں کے پاس نہیں ہے - وہ سوال یہ ہے کہ

ان شخصی املاک کو مجتمع کر کے جن ہستیوں کے تصرف میں دیا جائے گا اور پوری قوم کو جن کے رحم و کرم پر چھوڑا جائے گا، کیا وہ عدل و انصاف کے پتلے اور کسی سرخ جنت کے فرشتے ہوں گے۔ وہ بھی درحقیقت سوشلزم کے اپنے نظریے کے مطابق حیوان یا شیطان ہی ہوں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ غیر محدود ذرائع پا کر وہ ابلیس اعظم بن بیٹھیں۔ اگر وہ ظلم، حق تلفی اور ناانصافی پہ اتر آئیں تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوگا؟

اسلام اور سوشلزم کے اس اصولی فرق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اب آپ قرآن مجید کی آیت مذکورہ پر غور کریں۔ اس میں پہلے فرمایا گیا: "یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" "اے نبی، تم سے مسلمان سوال کرتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں"۔ یہ انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ پہلے ایک ایسا معاشرہ ترتیب دیا گیا ہے جس کے پاس مال موجود ہے جسے سلب نہیں کیا گیا۔ مگر وہ مال کی محبت اور مادہ پرستی میں مبتلا نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے پر خود تیار ہے۔ آمادگی نفس اور خوش دلی کے ساتھ خود پوچھتا ہے کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا "قُلِ الْعَفْوَ" (ان سے کہہ دو کہ جو ضرورت سے زاید ہو، وہ خرچ کرو)۔ جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ جو کچھ ان کے پاس زاید از ضرورت ہے وہ تم قومی ملکیت قرار دے کر ضبط کر لو۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جو کچھ زاید از ضرورت ہے اسے خرچ کریں۔ اس ارشاد میں تین باتیں صاف طور پر مضمر ہیں، ایک یہ کہ فرد اپنی جائز ملکیت کا مالک ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس میں سے انفاق فی سبیل اللہ اپنی آزاد مرضی کے ساتھ رضاکارانہ طور پر کرے گا۔ اگر اسے انفاق کی تربیت اور مواقع حاصل نہ ہوں گے تو جو کچھ ڈنڈے کے بل پر اس سے وصول ہوگا وہ انفاق سے زیادہ تاوان کی تعریف میں آئے گا، تیسری بات یہ کہ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ ایک شخص کا کتنا مال اس کے لیے ضروری ہے اور کتنا زاید از ضرورت ہے، اس کے لیے کوئی مستقل لگا بندھا اور قانونی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک صحیح اور معیاری اسلامی معاشرے کے معتدل ماحول میں ہر مسلمان خدا سے ڈرتے ہوئے خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے انفرادی اور معاشرے کے اجتماعی حالات کے اعتبار سے اس کے مال کی کتنی مقدار پہ عفو کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور اس میں سے کیا کچھ اسے اسلامی ریاست کے سپرد کر دینا چاہیے یا محتاجوں کو براہ راست دے دینا چاہیے۔ جن اشتراکی ریاستوں نے اس کے برعکس یہ قاعدہ بنایا تھا کہ حکومت ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لے اور اس کی ضروریات کا تعین اور ان کی فراہمی بھی حکومت ہی کرے"

یہ قاعدہ تجربے کے بعد ناکام ہو گیا اور اس میں بار بار ترمیم کرنی پڑی حتیٰ کہ اب اشتراکیت خود اس قاعدے سے دست بردار ہو گئی۔

بہر کیف اگر ایک اشتراکی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم قرآن میں غوطہ زن ہوں تو ہمارے سامنے قُلِ الْعَفْوَ کی جو پوشیدہ حقیقت نمودار ہوتی ہے، وہ یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ ہمارا اقبال مرحوم کے بارے میں بھی حسنِ ظن یہی ہے کہ ان کے پیشِ نظر بھی یہی حقیقت ہو گی۔

یہ بحث صرف قل العفو کی تشریح تک محدود تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو سرمایہ دار اور دولت کا پجاری اسلام کی اخلاقی تعلیمات و ہدایات سے متاثر نہیں ہوتا، اسے راہ راست پر لانے کے لیے اسلام کوئی قانونی و انسدادی تدابیر تجویز ہی نہیں کرتا۔ اسلام ایسے زر پرستوں کو درست کرنے کے لیے یقیناً ایک لائحہ عمل رکھتا ہے جو معاشرے کے غیر معمولی حالات میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور جسے آج بھی کیا جانا چاہیے۔ لیکن اسلام مساواتِ شکم کو بطور ایک ایسے اصل الاصول کے تسلیم نہیں کرتا جس کے گرد پوری زندگی کو گھمایا جائے اور جس پر کسی متنفس کے عقیدہ، اخلاق، عزتِ نفس اور آزادیٔ ضمیر کو قربان کیا جا سکے۔ امیر ہو یا غریب اگر اس کی انسانیت اور اس کے اندر کا اخلاقی وجود ہی ختم ہو جائے تو محض پیٹ کے بل پر اس کا زندہ رہنا، نہ رہنا یکساں ہے۔ جب تک اسلام کے ہمہ گیر اور جامع اصولوں کے مطابق عقائد و اخلاق، معیشت و معاشرت، تعلیم و سیاست، غرض یہ کہ زندگی کے ہر پہلو میں بیک وقت اصلاحی مہم جاری نہ ہو، کسی ایک شعبۂ حیات میں بھی اسلامی عدل و انصاف کا قیام ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے اس شعر کا تعلق ہے کہ "جس کھیت سے دہقاں کو . . . " اس سے جو لوگ تشدد، قانون شکنی اور غارت گری کا جواز نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، ان لوگوں کی سخن فہمی اور عقل و خرد لائق ماتم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اپنے آپ کو متکلّم کی حیثیت میں رکھ کر اس شعر میں اپنا کوئی ذاتی نظریہ بیان نہیں کیا. نہ انہوں نے اس شعر کو کسی کسان کانفرنس یا مزدوروں کے جلسے میں خطاب کے لیے موزوں کیا ہے دراصل انہوں نے یہاں عالمِ تخیّل و تمثیل میں ذات باری کو اپنے کارکنانِ قضا و قدر کے نام یہ فرمان جاری کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ "تم میری دنیا میں ایسا اور ایسا کرو۔" ظاہر ہے کہ آسمان کی باتیں الگ ہیں اور زمین کی الگ۔ اللہ تعالیٰ کے عالمِ تکوینی کے معاملات و احکام اور ہیں اور عالمِ تشریعی کے احکام اور ہیں۔ اللہ احکم الحاکمین اور اس کے

مطبوعات

تجارتی سود، تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے | تالیف: جناب فضل الرحمن صاحب، لیکچرار شعبۂ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ملنے کا پتہ: یونیورسٹی پبلیکیشنز، ظہور وارڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (بھارت) صفحات ۱۷۶، قیمت درج نہیں۔

مغربی اندازِ فکر اور مغربی نظامِ معیشت نے مسلم معاشرے پر جو مختلف اثرات مرتب کیے ہیں ان میں ایک اثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں شریعت کے وہ مسلّمہ حقائق بھی نزاعی امور کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں جن کے بارے میں پہلے کبھی دو رائیں نہ تھیں۔ سود کی حرمت ان مسلّمات میں ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ قرآن مجید کے احکام، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل، فقہائے امت کی تصریحات سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اسلام میں سود خواہ کسی نوعیت کا ہو، حرام ہے اور اس کی حلّت کا کوئی جواز نہیں۔ مگر جو سرمایہ دارانہ نظام اس وقت ہم پر مسلّط ہے، چونکہ اس کی بنیاد سود پر قائم ہے، اس لیے ہماری ملّت کے بعض "خیر خواہوں" کو اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کسی طرح اسے شرعی نقطہ نظر سے جائز ثابت کر دیا جائے تاکہ مسلمان اس حرام کو ایک حلال اور طیّب شے سمجھ کر خوشدلی کے ساتھ ہضم کریں۔ اس سلسلے کی پہلی

(بقیہ: رسائل و مسائل)

فرشتے تو دن رات انسانوں پر مصائب و شدائد بھی نازل کرتے ہیں، ان کی جانیں بھی قبض کرتے ہیں، تو کیا اب بعض انسان بھی خدائی کے مقام پر فائز ہونا چاہتے ہیں اور اپنے مخاطبین کو ملائکہ سمجھ کر انہیں یہ حق دینا چاہتے ہیں کہ وہ جس کی جان و مال پر چاہیں بلا تکلف ہاتھ ڈال دیں اور خدا کی زمین میں جو نباہی چاہیں مچاتے پھریں؟

کوشش ڈپٹی نذیر احمد نے کی۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری نے اس کے جواز کے لیے چند مضامین لکھے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب دراصل ان مضامین کا ناقدانہ جائزہ ہے جو خود ایک عالمانہ تصنیف کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں جو تجارتی سُود کے تاریخی جائزے پر مشتمل ہے اس امر کا کھوج لگایا گیا ہے کہ جن ملکوں اور قوموں سے عربوں کے تعلقات قبل اسلام تھے ان میں پیدا آوری قرضوں کی صورت کیا تھی اور پھر عہد نبوی میں اس میں کس نوعیت کی تبدیلیاں ہوئیں۔ کتاب کا یہ حصّہ بڑا وقیع اور جاندار ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ربا اور اس کی مختلف شکلوں پر بڑی بصیرت افروز بحث ہے۔ فاضل مصنّف کی مندرجہ ذیل صراحت ملاحظہ فرمائیں:

"لوگوں کے ذہنوں میں یہ ایک عام مغالطہ ہے کہ عرب جاہلیت میں صرف محتاج اور غریب ہی قرضہ لیا کرتے تھے۔ یا صرف صرفی مقاصد کے لیے ادھار خریدا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ زبردست تجارتی جدوجہد اور ربا کے انتہائی ترقی یافتہ ادارے نے بیوع اور شرکت کی ایسی صورتوں کو جنم دیا تھا جن کا انحصار صرف قرض اور ادھار پر تھا۔ قرض اور اُدھار خریداری کا مطلب جاہلیت میں ہرگز یہ نہ تھا کہ خریدار لازمی طور سے غریب و محتاج ہو۔ اس نقطۂ نظر کی تردید صحیح بخاری کی ایک حدیث سے واضح طور سے ہوتی ہے جو کتاب البُیُوع میں ملتی ہے۔ یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے قرض خواہوں کے طرزِ عمل کی تعریف فرمائی ہے جو خوشحال اور مالدار کو مہلت دیتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صرف غریب ہی قرض خرید و فروخت نہ کرتے تھے۔ اس زمانے کے عربوں نے ایک دستور قرض خریدنے کا اور بقایا کی ادائیگی میں مہلت کے عوض سود ادا کرنے کا بنا لیا تھا۔" (ص ۲۲)

پوری کتاب بڑی ٹھوس اور مستند معلومات پر مشتمل ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ جو لوگ تجارتی سُود کو جائز قرار دینے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے اور ان کے زمانے میں لوگ نفع آور سُودی قرضوں سے ناآشنا تھے، بے وزن ہے۔ کتابت اور طباعت کا معیار

اچھا ہے۔ البتہ کتابت کی اغلاط بہت زیادہ ہیں۔

سورۂ انعام و سورۂ مائدہ۔ ترجمہ و تفسیر تالیف: میاں منظور احمد صاحب ایم۔اے۔ پروفیسر شعبۂ علومِ اسلامی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور۔ شائع کردہ علمی کتاب خانہ اُردو بازار، لاہور۔ سورۂ انعام صفحات ۱۸۴۔ قیمت ۶ روپے۔ سورۂ مائدہ صفحات ۲۴۶ قیمت ۶ روپے۔

پاکستان کے تعلیمی بورڈوں اور یونیورسٹیوں نے جب سے اسلامیات کو بطور مضمون نصاب میں شامل کیا ہے اسی وقت سے نصابی ضروریات کے پیش نظر بعض نہایت اچھی کتب مرتب کی گئی ہیں۔ زیر تبصرہ تصانیف بھی اسی مفید سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ سورۂ انعام اور سورۂ مائدہ ایم۔اے علومِ اسلامیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ کے لیے یُوں تو اس ملت کے محققین اور مفسرین نے تفسیر کا نہایت اچھا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے مگر اس کے باوجود اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی بالغ نظر استاد طلبہ کے معیار، ان کی ذہنی الجھنوں اور ان کی ضروریات کو سامنے رکھ کر تفسیری مواد کو ایک جگہ جمع کر دے۔ اس ادق اور مشکل کام کو فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری سے سرانجام دیا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک ان تصانیف کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ مصنف نے قدیم و جدید تفسیری لٹریچر سے استفادہ کیا ہے مگر کہیں بھی تجدد پسندی کے رُجحانات کو سرایت نہیں کرنے دیا اور انہی حقائق کو بیان کیا ہے جو ہمارے اسلاف کی نظر میں صحیح اور مستند اور روح اسلام کے عین مطابق ہیں۔ ان کتب سے عام قارئین بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتابت طباعت کا معیار گوارا ہے۔

پنجابی نامہ تالیف: جناب ارشاد احمد پنجابی۔ شائع کردہ: مرکزی اردو بورڈ، گلبرگ لاہور۔ صفحات ۲۷۸۔ قیمت: چار روپے۔

"پنجابی نامہ" پنجابی زبان کے ایسے الفاظ کا ذخیرہ ہے جو اردو زبان سے فطری مناسبت رکھتے ہیں اور اُسے وسعت دینے کے لیے اس میں بڑی آسانی کے ساتھ سموئے جا سکتے ہیں۔ اس ذخیرہ میں اچھی خاصی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جن سے اردو زبان بالکل ناآشنا نہیں اور اس میں بغیر کسی تکلف کے جذب ہونے کی صلاحیت

رکھتے ہیں۔ اردو اور پنجابی میں بیگانگی کو دُور کرنے اور اردو کے دامن کو وسعت دینے کے لیے یہ عمل بالکل ناگزیر ہے۔ کتاب کے مصنف بلاشبہ پنجابی زبان کے شیدائی ہیں مگر ان کے اندازِ فکر میں توازن اور تعمیر کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ پنجابی زبان کی آڑ میں علاقائی عصبیتیں اُبھارنا اور ملت کے شیرازے کو منتشر کرنا نہیں چاہتے بلکہ اسے اردو زبان کے قریب لاکر ان کے درمیان بعد کو دُور کرنے کے لیے متمنی نظر آتے ہیں۔

ذخیرۂ الفاظ کو مختصر عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے اور ہر لفظ کی مختصر طور پر اردو زبان میں تشریح بھی کردی گئی ہے۔

مرکزی اردو بورڈ نے اسے ٹائپ میں نہایت اچھے معیار پر شائع کیا ہے قیمت بالکل مناسب ہے۔

ریاض الاذکار | تالیف: حافظ گوہر دین صاحب۔ ملنے کا پتہ چک ۲۴۴ گ۔ب۔ ڈاک خانہ خاص، براستہ جڑانوالہ، ضلع لائل پور۔ صفحات: ۱۲۳۔ قیمت ۷۵ پیسے۔

کتاب کے مصنف ایک صاحبِ دل بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تبلیغ دین میں گزارا ہے۔ زیرہ تبصرہ کتاب بھی ان کے اسی جذبۂ تبلیغ کی مظہر ہے۔ اس میں محترم حافظ صاحب نے اسلامی تعلیمات کو بڑے سادہ اور سہل انداز میں قلمبند کیا ہے۔

یہ مختصر سی کتاب بڑی مفید ہے۔ ہم اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

زندگی | تالیف، پروفیسر اسرار احمد سہاروی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ مطبوعات انجمن طلبائے ادب ۲۴/ بی سٹلایٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ۔ صفحات ۱۰۹۔ قیمت دو روپے۔

یہ ایک اخلاقی ناول ہے جس میں معاشرتی مسائل کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کے اپنے الفاظ میں اس ناول کے لکھنے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ ضدی اور ظالم قسم کے ماں باپ اور نامعقول قسم کی ساس، نندیں، اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کریں کہ کس طرح اپنی عاقبت نااندیشی سے اپنے جگر گوشوں کو قبر میں سُلانے کا سامان مہیا کر دیتی ہیں۔ یہ ناول ضبطِ نفس، عفت و پاکدامنی اور خلوص نیت جیسی بلند انسانی اقدار کو اُبھار کر سامنے

لاتا ہے۔ انداز بیان بڑا مؤثر ہے اور ناول نگار کے گہرے احساس کا پتہ دیتا ہے۔

مقالاتِ یومِ شبلیؒ | مرتب: حافظ نذر احمد صاحب۔ ناشر: مسلم اکیڈیمی، ۱۸ محمد نگر۔ لاہور۔ صفحات ۱۰۰۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔

۱۹۶۸ء میں شبلی کالج، لاہور میں بڑے اہتمام کے ساتھ یوم شبلی منایا گیا۔ اس میں ملک کے نامور اصحاب علم نے شرکت کی اور مولانا شبلی مرحوم کی علمی اور تصنیفی سرگرمیوں پر متعدد مقالات پڑھے۔ زیر تبصرہ کتاب ان بیش قیمت مقالات کا مجموعہ ہے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر افتخار احمد چشتی، سید غلام شبیر بخاری، مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل، پروفیسر شیخ محمد عثمان، ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی۔ احسان بی۔ اے اور خالد کاشمیری شامل ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے زخم | تالیف: گلب پاشا۔ ترجمہ: جناب ضیا شاہد۔ شائع کردہ: مکتبہ اردو ڈائجسٹ۔ سمن آباد، لاہور۔ صفحات: ۷۵۔ قیمت ۲ روپے۔

کتاب کے مصنف کا نام مشرقِ وسطیٰ بالخصوص اُردن کی تاریخ اور اُس کے حالات پر نظر رکھنے والوں کے لیے نیا نہیں وہ نسلاً انگریز ہیں مگر انھوں نے عرب ممالک اور خاص طور پر اُردن کے ساتھ ایسی مناسبت پیدا کی کہ وہ عرب معاشرے کے اندر پوری طرح جذب ہو کر رہ گئے۔ ان کی قابلیت پر اعتماد کر کے انہیں اُردن کی عرب فوج کی قیادت سونپی گئی اور ۱۹۲۸ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کے عرصے میں وہ فوج پر ہی نہیں بلکہ اُردن کی سیاست پر چھائے رہے۔ عرب ممالک سے اتنا قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے گلب پاشا کی تصریحات میں گہرائی ہے ۔۔۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے برطانوی قوم اور حکومت کو صہیونیت نوازی کی پالیسی کے تباہ کن نتائج سے خبردار کیا ہے اور اسے بتایا ہے کہ روس اگر مشرقِ وسطیٰ پر قابض ہو گیا تو نہ صرف عرب ممالک برباد ہوں گے بلکہ خود برطانوی مفادات کو بھی شدید نقصان پہنچے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالات کو سمجھنے کے لیے یہ ایک مفید کوشش ہے۔ فاضل مترجم نے اس تصنیف کو بڑی عمدگی اور فنی مہارت کے ساتھ اُردو کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ کتاب کا معیار کتابت و طباعت اونچا ہے۔

(بقیہ اشارات)

کے لیے کوشاں رہتا ہے اور ہر آن ایسی تدابیر سوچتا اور ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے کہ اسے مغلوب کیا جا سکے۔ انسان فطرت کو اپنا حریف سمجھتا ہے اور فطرت انسان کی سب سے بڑی دشمن و مزاحم طاقت ہے "تسخیر کائنات" کی اصطلاح میں انسان اور فطرت کے درمیان باہمی عداوت کا یہی غلط نظریہ پوری طرح جھلکتا ہے۔

اس تصور کی بنیاد پر جتنے فلسفے بھی گھڑے گئے ہیں وہ فطرت کا نہایت ہی گھناؤنا عکس پیش کرتے ہیں۔ ان سب کی رُوح یہ ہے کہ فطرت حسنِ ازل کی جھلک نہیں، رحیم اور مہربان خالق کا عطیہ نہیں، بلکہ قہر و غضب کی طاقت ہے جو انسانوں کو ہر لمحہ اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتی رہتی ہے اور جب تک انسان اپنی قوت کے زور سے اسے زیر نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک وہ اس کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی باطل تصوّر کے تحت ادباء و شعراء نے اس کے اندر خالق کا حسن و جمال دیکھنے کے بجائے اُسے روح فرسا مناظر کا مرقع سمجھا اور اسے ایک پرندے سے تعبیر کیا جس کی چونچ اور پنجے خوُن آلود ہوں[۱]۔

فطرت کے بارے میں اِس تاریک تصور سے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء اور مالتھس کے نظریۂ آبادی نے جنم لیا اور انسان کے دل میں یہ غلط احساس بٹھایا کہ فطرت دنیا کی ہر ذی رُوح شے کی مخالف اور دشمن ہے اور وہ اس سے اپنی دشمنی کا اظہار اس طرح کر رہی ہے کہ اس نے وسائل کو اس کی ضروریات سے ہمیشہ کم اور غیر مناسب رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر آن اور ہر طرف ایک کشمکش برپا ہے اور ہر نوع، اور نوع کا ہر فرد محض بقا کے لیے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور جو اس کشمکش میں باقی رہ جاتا ہے وہی جینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق حالات کی نامساعدت اور مجبوری سے ارتقاء کا عمل شروع ہوتا ہے اور مسلسل آویزش کے ذریعے بلند تر انواع پیدا کرتا ہے۔

اس طرح آبادی کے معاملے میں بھی یہ تاثر قائم کیا گیا ہے کہ فطرت انسانوں کے ساتھ بڑا شرمناک کھیل کھیل رہی ہے۔ انسانی آبادی میں سرعت کے ساتھ اضافہ کرتی چلی جاتی ہے مگر اس کے مقابلے میں خوراک کی پیداوار

---

۱ NATURE RED IN CLAW & BEAK

بڑھنے نہیں دیتی اور اس طرح انسان کی تباہی اور بربادی کا سامان کرتی ہے۔ فطرت کے اس ظلم و استبداد سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان کو بالکل منظم کر کے اور اسے بے حس ٹینک اور منجنیق بنا کر فطرت کے خلاف جنگ آزما ہونے پر آمادہ کیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ انسان کی آزادی سلب کی جائے اور اس کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اُسے بھی مشین کے بے جان پُرزے بنا کر اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی مفروضے کے تحت اب انسانوں کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے اور نظم اجتماعی اُن سے اُسی بے حسی کے ساتھ کام لیتا ہے جس بے حسی کا مظاہرہ کوئی مشین اپنے پُرزوں کے معاملے میں کرتی ہے۔

منصوبہ بندی کا یہ تصوّر محض اشتراکی نظام ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر مادّی نظام کا فطری خاصہ ہے۔ یہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ مادّی حالات نہ صرف انسانی زندگی کی خارجی ہیئت کو تشکیل دینے میں فیصلہ کُن اہمیت رکھتے ہیں بلکہ داخلی کیفیات کو بھی جس سانچے میں چاہتے ہیں ڈھال لیتے ہیں۔ چنانچہ جس دن سے مادیت نے انسانیت کے دل و دماغ پر قبضہ کیا ہے اسی روز سے انسانی زندگی کی جکڑ بندی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ انسانی زندگی کو منظم کرنے کے لیے جب داخلی طور پر کوئی محرک باقی نہ رہے تو اسے کسی نظم کا پابند بنانے اور اس کی صلاحیتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے اجتماعی جکڑ بندیوں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اجتماعیت اس کی قوتوں سے پُورا فائدہ اٹھا سکے۔ قوم پرستی، نسل پرستی، وطن پرستی اور ریاست اور مملکت پرستی سب مادّی تصوّر کے مختلف شاخسانے ہیں۔ ان میں کیفیت کا کوئی فرق نہیں بلکہ جو کچھ فرق ہے وہ صرف دائرۂ کار کا ہے۔

اجتماعیت کے جھوٹے خدا کی پرستش نے انسانی زندگی کی رُوحانی اور اخلاقی بنیادوں کو جس قدر شدید نقصان پہنچایا ہے اس کے تصوّر سے انسانی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ انسان جب کسی مشین کا بے بس پرزہ ٹھیرا تو پھر معاشرے کو اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِس پُرزے کو کسی مقام پر فٹ کرنے کے لیے صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسے اس مقام پر رکھ کر ملکی دولت میں کس قدر

اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ روس کے بیگار کیمپ اس اجتماعیت کی نہایت گھناؤنی تصاویر پیش کرتے ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کو صرف یہ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں فلاں فلاں منصوبے کی تکمیل کے لیے فلاں فلاں مقامات پر اتنے انسان درکار ہیں۔ پھر پولیس اور فوج ان بے بس اور مظلوم افراد کو خفیہ کارروائیوں کے ذریعہ اس بے دردی کے ساتھ ان مقامات پر پہنچاتی ہے کہ ان بیچاروں کے بیوی بچوں تک کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی اور وہاں ان سے زیادہ سے زیادہ مشقت لینے کے لیے ان سے ایسا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے مختصر طور پر مادی فلسفۂ حیات کے مختلف پہلوؤں اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات کا جو جائزہ لیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں روح کے اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نظاموں نے جو تہذیب پیدا کی ہے وہ بالکل ایک جیسی ہے۔ ہمارے اس ملک میں اشتراکیت کے علمبرداروں میں وہی لوگ شامل ہیں جو مغربی تہذیب کے پرستار ہیں اور اسلام کی اخلاقی قیود کو اپنے لیے بار سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انہیں اپنی عافیت اس میں نظر آتی ہے کہ وہ اشتراکیت کو اپنا لیں۔ اخلاقی احساسات ان کے اندر پہلے ہی مر چکے ہیں۔ روح ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ دین کے اخلاقی ضابطوں سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ اس بنا پر اشتراکیت اختیار کرنے ہی میں انہیں راہِ نجات دکھائی دیتی ہے۔

نوٹ

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کا فون نمبر ۲۵۰۷ سے تبدیل ہو کر نمبر ۵۲۵۰۷ ہو گیا ہے